ڈاکٹر خالد امین

تحریکِ اتحادِ اسلامی کے اردو شاعری پر اثرات

تحریکِ اتحادِ اسلامی (Pan Islamism) انیسویں صدی میں مسلمان ممالک کو انحطاط سے نکالنے کے لیے جمال الدین افغانی اور سلطنت عثمانیہ نے شروع کی۔ چوں کہ ہندوستانی مسلمان سلطنت عثمانیہ کی خلافت کو روحانی، سیاسی اور تہذیبی طور پر اپنا رہ نما تسلیم کرتے تھے اس لیے ہندوستان کے مسلم دانش وروں کا بڑا طبقہ تمام تر مسلکی اور علاقائی اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر اس میں شامل ہو گیا۔

ان دانش وروں میں علما، سیاست دان اور ادیب شامل تھے۔ اس لیے اس تحریک کے اثرات ادب پر نہایت وسیع انداز میں موجود ہیں۔ اسی لیے انیسویں صدی کے اردو ادب پر عالم گیر سیاسی اثرات کئی حوالوں سے موجود ہیں۔ اس مقالے میں اس تحریک کو مدِ نظر رکھتے ہوئے چند اہم اور منتخب شاعروں کی شاعری کا جائزہ لیا جائے گا۔

تحریک اتحادِ اسلامی کے اثرات اپنی جگہ مگر ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب نے کئی حوالوں سے ہندوستانی معاشرے پر ہمہ گیر اثرات مرتب کیے ہیں اور اردو شاعری بھی اس انقلاب کا خاص موضوع رہی ہے۔[۱] پھر ہندوستانی مسلمان جن سیاسی اور سماجی حالات سے دوچار تھے اس نے ان کے ادب پر گہرے اثرات مرتب کیے، ان میں وطنیت کا تصور سیاسی محکومی کا شدید احساس اور اتحاد بین المسلمین کا جذبہ ابھر کر سامنے آتا ہے۔[۲] ملکی زندگی کے یہ چند خدوخال بیسویں صدی کے ابتدائی عشرے میں ہنگامے کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

اس دور میں ہر شخص زندگی کے مسائل و مصائب کا ہمت سے مقابلہ کرنا سیکھ چکا تھا اور اپنی ذات کا عرفان اس قدر بلند ہو گیا تھا کہ کسی فرضی معشوق کے آستانے پر مسلسل ناصیہ فرسائی ممکن نہ رہی تھی۔ وطن کی سربلندی، قوم کی اصلاح، ملت کی تعمیر، مشاہیر اور اکابر کی تعریف، سیاسی مسائل کا ذکر، مناظر قدرت کو بیان کر کے شعرا ادبی عظمت محسوس کرنے لگے تھے۔[۳] اگر مزید صراحت پیش کی جائے تو اس دور میں غزل گوئی کے قدیم رجحانات پر زوال آ گیا تھا۔[۴]

تحریک اتحاد اسلامی کے رجحانات شاعروں کے یہاں شہر آشوب میں بھی دکھائی دیتے ہیں۔ ان نظموں میں جہاں ملت کے برباد ہو جانے کا غم موجود ہے وہاں اس بات کا بھی ملال ہے کہ اگر یہ ملت ایک کڑی میں پیوستہ ہوتی تو شاید یہ دن نہ دیکھنے پڑتے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا ایک شاعر میر محمد اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی جسے مجاہد شاعر بھی کہتے ہیں۔[۵] انھوں نے اپنی شاعری میں

مغربی اثرات جو ہندوستانی معاشرے میں پڑ رہے تھے اس کا اثر قبول نہیں کیا بلکہ اپنی شاعری کے لیے ایک نئی راہ کا انتخاب کیا۔ اس جنگ آزادی میں چوں کہ وہ خود بھی شریک تھے اس لیے اس کی ناکامی کا انھیں بے حد قلق تھا۔ انھوں نے اپنی حبسیہ شاعری میں اس کا ذکر نہایت دردمندانہ انداز میں کیا ہے ان کی ایک غزل میں ملت میں نااتفاقی اور انگریزوں کی دیدہ دلیری کا اندازہ کیا جاسکتا ہے:

سر کاٹنے کی تیغ ادا کو خبر نہ ہو — یوں جان لیجیے کہ قضا کو خبر نہ ہو
دل سے سوا بلند رہے حوصلہ مرا — پہنچوں وہاں کہ بخت رسا کو خبر نہ ہو [۶]

میر اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی کے تصور ملت کی اور نکھری ہوئی صورت تحریک جہاد کے متعلق مومن خان مومن کی مثنوی جہادیہ میں نہ صرف آزادی حاصل کرنے کی تلقین کی گئی تھی بلکہ بے دین نصاریٰ سے بھی نجات حاصل کرنے کو مذہبی فریضہ کہا گیا ہے۔[۷] وہ کہتے ہیں:

کوئی دے دیں فزا جام کا (کذا) — کہ آجائے بس نشہ اسلام کا
برنگ مئے ایماں کو آجائے جوش (کذا) — نہ اپنا رہے اور نہ دنیا کا ہوش
یہی اب تو کچھ آگیا ہے خیال — کہ گردن کشوں کو کروں پائمال
بہت کوشش و جاں نثاری کروں — کہ شرع پیمبر کو جاری کروں
دکھادوں بس انجام الحاد کا — نہ چھوڑوں کہیں نام الحاد کا [۸]

مومن خان مومن نے بھی جہاں ملی احساس کو نمایاں کیا ہے وہاں انھوں نے اتحاد بین المسلمین کا بھی درس دینے کی کوشش کی ہے۔ تحریک جہاد صرف انگریزوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے ہی نہیں چلائی گئی تھی بلکہ اس کے پس منظر میں اسلامی شریعت کا بھی نفاذ تھا اس تحریک کی ناکامی نے اس پورے عمل کو کافی نقصان پہنچایا۔ مثلاً ان کے ان اشعار میں اتحاد اسلام کا منظر یوں بیان ہوا ہے:

خبردار ہو جاؤ اے اہلِ دل — کہ رحمت برستی ہے اب متصل
ہوا مجتمع لشکر اسلام کا — اگر ہو سکے وقت ہے کام کا
جو داخل سپاہِ خدا میں ہوا — فدا جی سے راہِ خدا میں ہوا
حبیبِ حبیبِ خداوند ہے — خداوند اسی سے رضامند ہے [۹]

ان نظموں اور مثنویوں میں عیسائی پادریوں کی چیرہ دستیوں اور عوام کے معاشی استیصال کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ اس حوالے سے مولوی لیاقت اللہ کی ایک مثنوی قابل ذکر ہے۔ یہ انگریزوں کے خلاف جہاد کے پرجوش مبلغ تھے۔ کنہیالال کپور کا کہنا ہے

کہ ''موصوف الٰہ آباد میں جگہ جگہ وعظ کرتے پھرتے تھے اور انھوں نے وہاں کے باشندوں میں نصاریٰ کی حکومت کے خلاف انتہائی جوش پیدا کر دیا تھا یہ نظم صرف سنائی ہی نہیں جاتی بلکہ جگہ جگہ دیواروں پر چسپاں بھی کر دی گئی تھی۔ لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ اسے کھڑے ہو کر پڑھتے اور نعرے لگاتے ہوئے آزادی کی راہ میں لڑنے کے لیے تیار ہو جاتے۔ اس جہادیہ مثنوی میں قرآن و حدیث کی روشنی میں جہاد کی تلقین کی گئی ہے۔''۱۰

جو مسلمان رہِ حق میں لڑا لحظہ بھر — روضۂ خلدِ بریں ہوگیا واجب اس پر
اے برادر تو حدیثِ نبوی بھی سن لے — باغ فردوس ہے تلوار کے سائے کے تلے
دل سے اس راہ میں پیسہ کوئی دیوے گا اگر — سات سو اس کو خدا دیوے گا روزِ محشر
حق تعالیٰ کو مجاہد وہ بہت بھاتے ہیں — مثلِ دیوار جو سر باندھ کے جم جاتے ہیں
اے مسلمانو! سنی تم نے جو خوبیِ جہاد — چلو اب ان کی طرف مت کرو گھر بار کو یاد ۱۱

مولانا الطاف حسین حالی: (۱۸۳۷ء۔۱۹۱۴ء)

قومی وملی شاعری کا آغاز حالی کی جدت پسند طبیعت سے اردو میں ہوتا ہے۔ انھوں نے روایتی غزل گوئی میں مضامین کے حوالے سے بھی بڑی اہم تبدیلیاں کی ہیں۔ حالی کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ وہ شاعری کے ذریعے اصلاح کا کام لیں۔۱۲ حالی کی مسدس کا جائزہ تو بعد میں لیا جائے گا پہلے ان کی غزل میں اتحادِ اسلام یا ملت کے موجود عناصر کا جائزہ لیتے ہیں۔

حالی کی غزل گوناگوں کیفیات، رجحانات اور مختلف حالات سے متاثر ہوتی رہی ہے۔۱۳ انھوں نے صداقت اور حقیقت نگاری اور نفس انسانی کا مطالعہ اپنی غزلوں میں پیش کیا ہے۱۴۔ اسی لیے ان کی غزل اس رویے کی وجہ سے زندگی کے وسیع تجربات و مشاہدات پر محیط ہے۱۵۔ اس کی وجہ سے غزل میں شعور و احساس کی ایک نئی فضا، خیالات کی ایک نئی دنیا نظر آئے گی۔ سیاسی حالات، اخلاق، عمرانی تصورات، قوم کی بربادی پر نوحہ، تعمیرِ نو کا جذبہ، غرض ہر مضمون ان کی غزل میں کا موجود ہے۔۱۶

دردمندی حالی کی سیرت اور کلام دونوں میں پائی جاتی ہے۔ اس لیے ان کی غزلوں کا لب ولہجہ ناصحانہ ہے۱۷ نصیحت کا یہ عمل ملی عناصر کو لیے ہوئے ایک عجیب طرزِ احساس کا حامل ہے جس سے اردو شاعری پہلے واقف نہیں تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ:

میں بچا تیرِ حوادث سے نشانہ بن کر — آڑے آئی مرے تسلیم سپر کی صورت
رہ نماؤں کے ہوئے جاتے ہیں اوسان خطا — راہ میں کچھ نظر آتی ہے خطر کی صورت
یوں تو آیا ہے تباہی میں یہ بیڑا سو بار — راہ میں کچھ نظر آتی ہے خطر کی صورت ۱۸

ناصحانہ رویوں کے علاوہ ان کی غزلوں میں ہندوستان کے سیاسی حالات کا ادراک بھی موجود ہے۔ انھوں نے شعوری طور پر غزل میں نیم سیاسی خیالات کو داخل کیا ہے۔ یوں بھی اگر اس وقت کے ہندوستان کے سیاسی حالات پر نظر ڈالی جائے تو شاید کسی بھی شاعر کے لیے ان خیالات سے مفر ممکن نہیں تھا۔ حالی کا کہنا ہے کہ:

دوبے نواؤں کو بھی کچھ جم کے جا نشینو! بس جام جم ہمارا اور ملک جم تمھارا
روسی ہوں یا تتاری ہم کو ستائیں گے کیا دیکھا ہے ہم نے برسوں لطف و کرم تمھارا ۱۹

پھر اسی غزل میں در پردہ طور پر ہم مسلمانوں کو یہ سبق دیا جا رہا ہے کہ حادثات، امیدوں اور حوصلوں کو جلا بخشتے ہیں لہذا سانحات سے عبرت حاصل کرتے ہوئے امید و حوصلہ کی جانب قدم بڑھانا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ حالی کی غزل نئے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو کر جہاں اپنے مزاج میں تبدیلی کا عندیہ دیتی ہے ۲۰۔ وہیں ملک و قوم میں جذبۂ تعمیر ان کا مستقل موضوع بن جاتا ہے۔ ۲۱

کھولی ہیں تم نے آنکھیں اے حادثو! ہماری احسان یہ نہ ہرگز بھولیں گے ہم تمھارا
پھرتے ادھر ادھر ہو کس کی تلاش میں تم گم ہے تمھی میں یارو باغ ارم تمھارا ۲۲

مسلمانوں میں موجود نااتفاقی کو انھوں نے یوں بیان کیا ہے:

غیروں کو لیں گے آخر اپنا بنا کے کیا ہم اپنوں ہی سے ہے حالی کچھ دل مکدر اپنا ۲۳

حالی کی غزل میں لفظیات پر غور کیا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ ان کی غزلوں کا انداز بھی نظمیہ ہے کیوں کہ غزل جب بھی اپنے روایتی انداز سے جدا ہوتی ہے فوراً اس کا انداز نظمیہ ہو جاتا ہے۔ مگر حالی کی غزل روایت سے انحراف نہیں ہے بلکہ ایک نئی روایت کی بنا ڈالتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اصل میں معاملہ یہ ہے کہ انھوں نے جس کام کا بیڑا اٹھایا تھا وہ ان کی شاعری سے کہیں عظیم تھا اور اسی کام نے ان کی غزلوں میں جدت کا احساس نمایاں کیا ہے۔ کئی مثالیں ایسی ملتی ہیں جس میں مسلمانوں کو متحد ہو کر رہنے کی تلقین کی گئی ہے:

دیں غیر دشمنی کا ہماری خیال چھوڑ یاں دشمنی کے واسطے کافی ہیں یار بس
آتا نہیں نظر کہ ہو یہ رات اب سحر کی نیند کیوں حرام بس اے انتظار بس
تھوڑی ہے رات اور کہانی بہت بڑی حالی نکل سکے گا نہ دل کا بخار بس ۲۴

حالی کی شاعری اپنی وسعتوں کی وجہ سے زندگی اور زمانے کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے اور نئی ادبی روایات کو بھی قائم کر دیتی ہے جو یقیناً ایک قوم اور ملک کا مقدس ورثہ ہیں۔ ان کی شاعری کے مطالعے سے ہم با آسانی مسلمان قوم کی ثقافت و تہذیب کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ حالی اپنے عہد اور مسلمانوں کی زبوں حالی پر اس انداز سے نوحہ کناں ہیں کہ بعض اوقات گریہ کا سا انداز محسوس ہوتا ہے انھوں نے غیروں کے تسلط کو طنز کا بھی نشانہ بنایا ہے:

ہر حکم پر ہوں راضی، ہر حال میں رہیں خوش　　حصے میں اب ہمارے یہ شادمانیاں ہیں ۲۶

اپنی ایک غزل میں عالم اسلام کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

وہ دن گئے کہ حکمت تھی مستند یمن کی　　ہے اب بجائے حکمت خاک اڑ رہی یمن میں
وہ دن گئے کہ موتی مشہور تھے عدن کے　　ہے کال موتیوں کا اب سر بسر عدن میں
قبرِ اویس پر ہے بس فخر اب قرن کو　　زندہ اویس کوئی باقی نہیں قرن میں ۲۷

اسی غزل کا یہ شعر مسلمانوں کی پوری عظمت رفتہ کا نقشہ پیش کرتا ہے۔

وہ قوم جو جہاں میں کل صدر انجمن تھی　　تم نے سنا بھی اس پر کیا گذری انجمن میں ۲۸

حالی کی غزل میں قوم وملت کی صورت حال کا دکھڑا جس انداز میں پیش کیا گیا ہے وہ کسی اور غزل گو شاعر کے یہاں کم ہی دکھائی دیتا ہے ۲۹۔ مسلمانوں پر چھائی ادبار کو دیکھ کر انھوں نے یوں شکوہ کیا ہے:

پہنچ اے خضر کہ ہے وقت مددگاری کا　　ڈگمگاتی ہے بہت دیر سے منجدھار میں ناؤ
دیکھیں کس طرح نہ سرسبز ہو پھر کشتِ امید　　آؤ اور ندیاں آج آنسوؤں کی مل کے بہاؤ
قافلے ساتھ کے جا پہنچے حرم کے لگ بھگ　　وقت اب ہاتھ سے جاتا ہے جو آتے ہو تو آؤ ۳۰

غرض یہ کہ حالی کی اور دیگر نظموں کے علاوہ غزل میں ملی نشاۃ الثانیہ کی بازگشت سنائی دیتی ہے انھوں نے مسلمانوں کی اجتماعی صورت حال کا شاید اس سے بہتر اظہار اور نہیں کیا ہوگا:

خندہ زن ہے اس مسلمانی پہ کفر　　جیسی ہے حالی مسلمانی مری ۳۱

مولانا حالی کی غزلوں کے علاوہ ان کی نظموں اور مسدس ''مدوجزر اسلام'' میں بھی پان اسلامزم کے خیالات ملتے ہیں۔ حالی کی ''مسدس'' اور ''شکوۂ ہند'' ایک ہی سلسلے کی دو کڑیاں ہیں۔ حالی کا ان دونوں نظموں میں اسلامیانِ ہند کی سیاسی، معاشرتی، معاشی اور اخلاقی زبوں حالی اور پستی و پامالی کی جو داستان بیان کی گئی ہے اس میں یکسانیت اور مماثلت تو ہے مگر دونوں نظموں میں مسلمانوں کے اوصاف کو جس انداز میں پیش کیا گیا ہے اس کی مثال ملنا کسی اور شاعر کے یہاں محال ہے۔ ۳۲ مسدس ''مدوجزر اسلام'' میں اتحاد اسلامی کے جذبات کو یوں اجاگر کرتے ہیں:

وہ گھر جس میں دل ہوں ملے سب کے باہم　　خوشی نا خوشی میں ہوں سب یارو ہم دم
اگر ایک خوش دل تو گھر سارا خرم　　اگر ایک غم گیں تو دل سب کے پُر غم ۳۳

حالی نے اس نظم میں عالمِ اسلامی کے ان خصائص کا تذکرہ کیا ہے جو مسلمانوں کا کبھی طرۂ امتیاز ہوا کرتا تھا۔ تحقیقی انداز میں مسلمانوں کے اہم اوصاف کو جس انداز میں انھوں نے پیش کیا ہے اس سے ان کے ملت کے تصور کو با آسانی سمجھا جا سکتا ہے۔۳۴ اس نظم میں موجود ملّتِ اسلامیہ کے عروج کے یہ مرقعے عظمتِ رفتہ کے دل پذیر نقوش اجاگر کر دیتے ہیں۔۳۵ انھوں نے مسدس میں ترکمانی صولت، اعرابی نطق، یثربی مہمان نوازی اور اخوت اسلامی کی ترکیبوں کو استعمال کر کے اپنے ملی شعور سے دوبارہ مسلمانوں کو ایک دوسرے سے وابستہ ہونے کی تلقین کی ہے۔ اگر اس نظم میں ان اوصاف کی فہرست کا مطالعہ کیا جائے تو یہ ملت اسلامیہ کی دیرینہ عظمت و وقار کا احساس اور اندازہ کرنے کے لیے کافی ہے۔۳۶

عراقین و شامی و خوارزم و توراں — جہاں جنس تعلیم سنتے تھے ارزاں
رہیں پے سپر کر کے کوہ و بیاباں — پہنچتے تھے طلاب افقاں و خیزاں
جہاں تک عمل دین اسلام کا تھا — ہر اک راہ میں ان کا تانتا بندھا تھا۔۳۷

عظمتِ رفتہ کے ان مرقعوں کو پیش کرنے کے بعد حالی دفعتاً زوالِ ملت کے دل خراش مناظر بیان کرنے لگتے ہیں جو پڑھنے والوں کے دلوں میں تڑپ جانے والی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ عروج و زوال کی اس داستان کا تجزیہ کرتے ہوئے حالی یہ حقیقت واضح کرتے ہیں کہ مسلمانوں کا عروج دینِ اسلام سے متابعت کا نتیجہ تھا اور ان کے موجودہ زوال کا سبب انھیں اصولوں اور اتحاد سے روگردانی و انحراف ہے۔۳۸

مسدس کے ایک حصے میں کہتے ہیں کہ:

جہاں کو ہے یاد ان کی رفتار اب تک — کہ نقشِ قدم ہیں نمودار اب تک
مَلایا میں ہیں ان کے آثار اب تک — انھیں رو رہا ہے ملیبار اب تک
ہمالہ کو ہیں واقعات ان کے ازبر — نشاں ان کے باقی ہیں جبرالٹر پر۔۳۹
نہیں اس طبق پر کوئی برّاعظم — نہ ہو جس میں ان کی عمارات محکم
عرب، ہند، مصر، اندلس، شام دیلم — بناؤں سے ہیں ان کی معمور عالم
سرِ کوہِ آدم سے تا کوہِ بیضا — جہاں جاؤ گے کھوج پاؤ گے ان کا۔۴۰

حالی کا کہنا ہے کہ دیلم یعنی بحیرۂ کیسپین کے جنوب کا پہاڑی علاقہ جو پہلے ایران میں تھا اب روس میں ہے۔۴۱ وہاں سے لے کر کوہ بیضا (اندلس میں ایک برف پوش چوٹی) تک مسلمانوں کے یادگار نقوش، تاریخ کا حصہ ہیں۔۴۲ حالی نے اس مسدس میں جا بہ جا استعارات کے ذریعے مسلمانوں کی عظیم قوتوں (جن میں سلطنت عثمانیہ بھی شامل ہے) کی بھی تصویر کشی کی ہے ساتھ ہی دیگر قو

موں اور ملکوں کی زبوں حالی کی صورت حال بیان کی ہے:

نہ وہ دور دورہ تھا عبرانیوں کا — نہ یہ بخت و اقبال نصرانیوں کا
پراگندہ دفتر تھا یونانیوں کا — پریشاں تھا شیرازہ ساسانیوں کا
جہاز اہل روما کا تھا ڈگمگاتا — چراغ اہل ایراں کا تھا ٹمٹماتا ۴۳

یہاں پر لفظ جہاز بہ طور استعارہ ہے، بحر روم پر تسلط اور زبردست جہازی بیڑے کی مناسبت سے حالی نے مسلمانوں کی اس عظیم الشان سلطنت کی جانب اشارہ کیا ہے جب کہ لفظ چراغ سلطنتِ ایران کی جانب اشارہ کر رہا ہے۔۴۴ حالی نے مسدس میں مسلمانوں کی ان جگہوں کا خاص طور پر ذکر کیا ہے جو کبھی سلطنت اسلامیہ کا حصہ تھیں مگر روس اور دوسری یورپی جارحیتوں نے اسے مسلمانوں سے چھین لیا۔ اپنے مسدس میں مسلمانوں کی مشہور علمی درسگاہوں کا بھی ذکر کیا ہے اور ہندوستانی مسلمانوں کو اس بات کی تلقین کی ہے کہ وہ اسی طرز پر دوبارہ اپنی نئی زندگی کی بنیاد ڈالیں۔

حالی کی شاعری مسلمانوں کے احیا کی تحریک کی آئینہ دار ہے۔ اس نظم میں انھوں نے اپنے ہاتھوں سے آئینہ خانہ بنایا ہے جس میں مسلمان قوم اپنی صورت حال ملاحظہ کر سکتی ہے کہ وہ کون تھے اور کیا ہو گئے۔۴۵ حالی کی شاعری مسلمانوں کے احیا کی تحریک کی آئینہ دار ہے۔ اس نظم میں انھوں نے اپنے ہاتھوں سے آئینہ خانہ بنایا ہے جس میں مسلمان قوم اپنی صورت حال ملاحظہ کر سکتی ہے کہ وہ کون تھے اور کیا ہو گئے۔۴۵

حالی نے یہ نظم اسی لیے لکھی تھی کہ مسلمانوں پر جو بلا خیز طوفان آئے تھے، اب ضرورت ہے دوبارہ اپنے آپ کو اس مشکل سے نکالنے کے لیے، جدوجہد کرنے کی، تاکہ دوبارہ مسلمان علم وفن کی دنیا میں اس کھوئے ہوئے مقام کو حاصل کر لیں جو ان کا شاندار امتیاز رہا ہے۔ اسی لیے اس نظم میں خود شناسی و خودنگری کی مثال کئی جگہ موجود ہے۔

الپ ارسلان سے یہ طغرل نے پوچھا — کہ قومیں جو دنیا میں ہیں جلوہ فرما
نشاں ان کے اقبال مندی کے ہیں کیا — کب اقبال مند ان کو کہنا ہے زیبا
کہا ملک و دولت ہو ہاتھ ان کے جب تک — جہاں ہو کمر بستہ ساتھ ان کے جب تک
جہاں جائیں وہ سرخرو ہو کے آئیں — ظفر ہم عناں ہو جدھر باگ اٹھائیں
نہ بگڑیں کبھی کام جو وہ بنائیں — نہ اکھڑیں قدم جس جگہ وہ جمائیں
کریں مس کو گر مس تو وہ کیمیا ہو — اگر خاک میں ہاتھ ڈالیں طلا ہو ۴۶

آخر میں انھوں نے مسدس میں دعا مانگی ہے اور یہ دعا ملت اسلامیہ کے نشاۃ الثانیہ کی خواہش لیے رقت انگیز انداز میں ڈھل کر دل سوزی و دردمندی کی تفسیر بن جاتی ہے:

اے خاصۂ خاصان رسل وقتِ دعا ہے — امت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے
جس دیں کے مدعو تھے کبھی سیزر و کسریٰ — خود آج وہ مہمان سرائے فقرا ہے
وہ دین ہوئی بزمِ جہاں جس سے چراغاں — اب اس کی مجالس میں نہ بتی نہ دیا ہے ۴۷

مولانا ظفر علی خان نے جنگِ بلقان کے سلسلے میں ہندوستانی مسلمانوں کو ترکوں کی مدد کے لیے جس طرح تیار کیا حالی اس سے متاثر تھے۔ انھوں نے ایک نظم ''شکریہ مساعی جمیلہ ظفر علی خان'' اگست ۱۹۱۳ء میں زمیندار اخبار کے لیے بھیجی تھی۔ ۴۸ اس نظم میں حالی کہتے ہیں کہ:

بلقان و طرابلس میں ناگاہ — اٹھا ستم و جفا کا طوفاں
ہمدردی اہل دیں نے آخر — جوہر ترے کر دیے نمایاں
جمعیت و صبر کا سراسر — دامن ہوا چاک تا گریباں ۴۹

حالی نے ۱۲ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو جنگ بلقان کے واقعات پر شدید رنج و غم کا اظہار کیا مگر اس واقعے سے قبل انھوں نے ایک قطعہ ترکی کے سلطان عبدالعزیز کے قتل کے بعد سرویا مانٹی نیگرو اور روس کے مقابلے میں ترکی نے جو جنگ کی اس پر بھی لکھا تھا۔ ۵۰

خبر ہے اے فلک کہ چار طرف — چل رہی ہیں ہوائیں کچھ نا ساز
رنگ بدلا ہوا ہے عالم کا — ہیں دگرگوں زمانے کے انداز
ٹڈیوں کا ہے کھیتیوں پہ ہجوم — بھیڑیوں کے ہیں خوں میں تر لب آز
ہو گا انجام دیکھیے کیا کچھ — ہے پُر آشوب جب کہ یہ آغاز
وقت نازک ہے اپنے بیڑے پر — موج حائل ہے اور ہوا ناساز ۵۱

مولانا شبلی نعمانی: (۱۸۵۷ء۔۱۹۱۴ء)

شبلی علی گڑھ تحریک میں وہ واحد شخص تھے جنھوں نے مفتی عبدہٗ اور رشید رضا کے نظریہ بین الاسلامیت سے خود کو نظریاتی طور پر وابستہ کیا۔ اسی لیے ان کے فکری کارناموں میں اس نظریے کی کارفرمائی نظر آتی ہے یہاں صرف ان کی شاعری میں موجود اتحاد اسلامی کے رجحانات کو پیش کرنا مقصود ہے۔ شبلی کی شاعری میں تاریخی اور اخلاقی نظموں کے نمونے ملتے ہیں ہر ایک نظم خوبی اور بلندی کے لحاظ

سے اپنی مثال آپ ہے۔ان نظموں نے ایک طرف اسلامی تاریخ کے انمول موتیوں کو ایک دھاگے میں پرو کر ان کے حسن کو دوبالا کیا تو دوسری جانب اردو زبان میں کسی حادثے اور سانحے کو نظم کرنے کے بہترین نمونے فراہم کیے۔۵۲ شبلی کی شاعری کا بڑا کمال یہ ہے کہ انھوں نے واقعات کو جس انداز میں جذبات سے ملایا ہے اس نے اردو شاعری میں ایک نئی روایت کو آگے بڑھنے کے اچھے نمونے فراہم کیے ہیں۔ان کی نظموں میں اسلامی روایتوں کے پرتاثیر واقعات اور اسلامی تاریخ کو فخریہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

شہرِ آشوبِ اسلام کے نام سے انھوں نے جو نظم لکھی اس کے بارے میں خواجہ کمال الدین صاحب نے لاہور سے مولانا کو لکھا تھا کہ اس نظم نے مجھ کو لندن میں تڑپا دیا۔اسلامک ریویو کے نکالنے کے محرکات میں یہ نظم بھی شامل تھی۔اس نظم کا اتنا چرچا ہوا کہ کئی لوگوں نے اس زمین میں طبع آزمائی کی۔۵۳

شبلی کی نظر میں دنیا کے تمام مسلم ممالک میں اگر کسی کا وقار مسلّم تھا تو ترکی کا۔جس کا گہوارہ تیرہ سو برس پہلے یثرب و بطحا میں رہ چکا ہے۔۱۸۹۶ء کی جنگ میں آرمینیا کا مسئلہ اٹھا تو اس وقت انگریزوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے شبلی نے اتحادِ اسلامی کی عکاسی کی۔ علی گڑھ چھوڑنے میں جہاں اور بہت سے محرکات کارفرما تھے وہاں ایک یہ بھی تھا کہ علی گڑھ کے اربابِ اختیار ترکی کے معاملے میں انگریزی نقطۂ نظر کے حامی تھے۔شبلی اس گھٹی ہوئی فضا کو برداشت نہیں کر پائے کیوں کہ وہ خلیفہ سلطان عبدالحمید اور ان کے رفقا کی کھل کر مدح کرنا چاہتے تھے۔۵۴

۱۹۰۸ء میں جب ترکی نے دستوریت کا اعلان کر کے اپنی بنیادوں کو مضبوط بنانے کی تدبیریں کیں تو اس وقت کئی مخالفتوں کے باوجود شبلی نے کہا کہ:

نالوں کو عندلیب کے میں نے دبا لیا　　بھاری ہوں لاغری میں بھی تنہا ہزار پر ۵۵

سلطان عبدالحمید سے انھیں گہری عقیدت تھی۔اس کا اظہار انھوں نے تمہیدِ قصیدۂ مدحِ سلطان عبدالحمید میں کیا ہے:۔

پھر بہار آئی ہے شاداب ہیں پھر دشت و چمن　　بن گیا رشکِ گلستانِ ارم پھر گلشن
شعلہ زن پھر چمنستان میں ہوئی آتشِ گل　　پھر صبا چلتی ہے گلشن میں بچا کر دامن
آگ پانی میں لگادی ہے کسی نے شاید　　حسن میں عکسِ گل و لالہ ہے یا جلوہ فگن ۵۶

شبلی نے اپنی نظموں میں اسی تسلسل کو برقرار رکھا ہے جو ان کی علمی و ادبی کاموں میں دکھائی دیتا ہے انھوں نے بدلے ہوئے حالات میں جب قوم مغرب سے مرعوب ہو کر شدید ذہنی غلامی میں مبتلا ہو چکی تھی ایک ایسا لائحہ عمل اپنے علمی و ادبی کاموں میں پیش کیا جس میں قدیم و جدید رجحانات کی جھلک دکھائی دیتی ہے مگر شبلی نے اپنی فکر کو صحیح معنوں میں واضح نہیں کیا۔اس لیے ان کے اثرات بھی

صرف علومِ اسلامیہ کے احیا کی صورت میں ایک علمی انقلاب برپا کرنے میں کامیاب دکھائی دیتے ہیں اور یہی عمل ان کی نظموں میں دکھائی دیتا ہے۔ ۵۷ مثلاً ان کی ایک نظم ''اسلام کے تنزل کا اصلی سبب'' میں اسی نقطے کو بیان کیا ہے:

لوگ کہتے ہیں کہ یہ بات ہے اب امرِ صریح — کہ زمانہ میں کہیں عزتِ اسلام نہیں
آپ جائیں گے جہاں قوم کو پائیں گے ذلیل — اس میں تخصیصِ عراق و عرب و شام نہیں ۵۸

اسی نظم میں مسلمانوں میں موجود اتحاد کی کمی کو یوں بیان کیا ہے:

نصِ قرآں سے مسلماں ہیں بھائی بھائی — اس اخوت میں خصوصیتِ اعمام نہیں
یاں یہ حالت ہے کہ بھائی کا ہے بھائی دشمن — کون سا گھر ہے جہاں یہ روشِ عام نہیں ۵۹

۱۹۱۲ء میں جب بلقان کی ریاستوں نے ترکی کے خلاف اعلان جنگ کیا اور انگریزوں کی مدد انھیں حاصل ہوئی تو اس وقت شبلی نے شہرِ آشوبِ اسلام ہنگامۂ طرابلس و بلقان کے موضوع پر یہ نظم لکھی اس نظم نے اردو شاعری میں اسلامی روایت کو بیان کرنے کے حوالے سے ایک نئی زندگی فراہم کی ہے۔ ۶۰ اس نظم کے متعلق اردو ادب میں کافی باتیں ہو چکی ہیں اس لیے یہاں پر صرف چند مثالیں پیش ہیں:

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک — چراغِ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک
قبائے سلطنت کے گر فلک نے کر دیے پرزے — فضائے آسمانی میں اڑیں گی دھجیاں کب تک
مراکش جا چکا، فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے — کہ جیتا ہے یہ ترکی کا مریضِ سخت جاں کب تک ۶۱

شبلی نے یہ نظم لکھنؤ کے ایک عام جلسے میں، جو ترکی کے لیے چندہ فراہمی کے لیے ہوا تھا، پڑھی تھی۔ خود بھی روئے اور دوسروں کو بھی رلایا۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ بھی کوئی لکھنؤ کی ماتمی مجلس ہے۔ ۶۲ ادھر جنگِ بلقان جاری تھی کہ مسجدِ کان پور کا دردناک واقعہ پیش آیا۔ کان پور میں ایک مسجد سے لگتی ہوئی ایک سڑک نکالی گئی اور مسجد کا وضو خانہ جو سڑک کے بیچ میں تھا، مسلمانوں کی مخالفت کے باوجود ڈھا دیا گیا۔ مسلمانوں نے دوبارہ اس کی تعمیر شروع کر دی، حکومت نے گولی چلانے کا حکم دیا اور کئی مسلمان شہید ہو گئے۔ لوگوں کا شہید ہونا تھا کہ مسلمانوں میں پہلے سے موجود بے چینی دو آتشہ ہو گئی۔ ابوالکلام آزاد، سید سلیمان ندوی، محمد علی جوہر اور دوسرے اکابرِ قوم نے انگریزی حکومت کے اس قہر و جبر پر سخت احتجاج کیا اور شبلی کی نظموں نے مسلمانوں کے دل میں جذبہ حریت کی آگ کو مزید تیز کر دیا۔ ۶۳ شبلی نے نظم ''کشتگانِ معرکۂ کان پور'' میں جس طرح مسلمانوں کو مخاطب کیا ہے ان کے اس رجز یہ نالوں نے مسلمانانِ ہند کی سیاسی جدوجہد میں ایک نئی تاریخ رقم کی۔

کل مجھ کو چند لاشۂ بے جاں نظر پڑے — دیکھا قریب جا کے تو زخموں سے چور ہیں

کچھ طفلِ خوردسال ہیں جو چپ ہیں خودمگر　　بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں
پوچھا جو میں نے کون ہو تم آئی یہ صدا　　ہم کشتگانِ معرکۂ کان پور ہیں ۶۴

شبلی نعمانی نے جب اپنا سفرنامہ لکھنا شروع کیا تو اس وقت ترکی اور برطانیہ کے حالات کافی کشیدہ تھے اس کے باوجود مولانا نے یہ سفرنامہ اس انداز میں لکھا کہ یہاں کے لوگوں کو ترکوں سے محبت ہو جائے اور مسلمانوں کی سیاست مقامی اثرات سے نکل کر بین الاقوامی رخ اختیار کرلے۔ ۶۵ ان کی نظموں میں بھی اسی رخ کو دیکھا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر انصاری کا طبی وفد جب ترکی سے واپس آیا تو یہ نظم کہی اس سے بھی ترکی کی محبت کا اظہار ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔

تمھیں سے تو پتا چلتا ہے شیدایانِ ملت کا　　کہ تم نے شاہدِ اسلام کے مفتوں بھی دیکھے ہیں
جنونِ جوشِ اسلامی کوئی سمجھا تو تم سمجھے　　کہ تم نے لیلیِ اسلام کے مجنوں بھی دیکھے ہیں
سہارا ہے اگر امید کا اب بھی کوئی باقی　　تو تم نے وہ رموزِ قوتِ مکنوں بھی دیکھے ہیں ۶۶

ہندوستانی مسلمانوں نے بار بار حکومت برطانیہ سے مطالبہ کیا کہ وہ مسلمانوں کی اساس کا لحاظ کرے اور بلقانی ریاستوں کی سیاسی امداد سے باز رہے مگر اس کا جواب یاس انگیز ملا۔ ۶۷ مولانا ظفر علی خان کو جنگِ بلقان کے موقعے پر جب ہندوستان میں عیدالاضحیٰ کی خوشی کا موقع تھا تو شبلی نے کہا کہ اپنی خوشیوں کو ترک کردیں اور ترکی کی مدد کریں۔ اپنے خط میں لکھتے ہیں کہ:

> ''میں نے جو فتویٰ لکھا ہے اس سے علمائے فرنگی محل بھی متفق ہیں اور مولوی عبدالباری صاحب کا خط بھی شائع ہو چکا ہے۔ بھائی! ترکوں کی امداد اس وقت فرض عین ہے اور قربانی کا درجہ واجب سے زیادہ نہیں، آپ کہتے ہیں کہ سنت ابراہیمی موقوف نہ ہو، ہاں وہی سنت مقصود ہے فرق یہ ہے کہ آپ اس کو لیتے ہیں جس کا مینڈھے پر عمل ہوا اور میں وہ پیش نظر رکھتا ہوں جو اسماعیل پر مقصود تھی کیا ترکوں کی جان مینڈھے سے بھی کم ہے۔'' ۶۸

اسی طرح جرائد اسلامیہ کے نام سے لکھے ہوئے خط میں بھی اس فتوے کے حوالے سے دلیل دیتے ہوئے شبلی نے لکھا تھا کہ:

> ''ترکوں کی اعانت اس وقت فرض عین ہے۔ اس لیے اس خاص موقعے اور ضرورت کے وقت اگر یہ فرض مقدم رکھا گیا تو اس سے آئندہ کے لے کیا حجت ہوسکتی ہے۔ قربانی شعائر اسلام ہے مسلمان اس کو چھوڑ نہیں سکتے، نہ کوئی قوم ان کو اس پر مجبور کرسکتی ہے، نہ وہ اس کے مقابلے میں دنیا کی کسی قوم کی پرواہ کرسکتے ہیں۔'' ۶۹

ان خطوط کے اقتباسات سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ شبلی تحریک اتحاد اسلامی کے کس حد تک قائل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جنگ بلقان کے دوران آغا خان نے ایک مضمون میں ترکوں کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ سرزمین یورپ چھوڑ کر ایشیا چلے جائیں تاکہ دول یورپ کے حملوں سے محفوظ رہیں تو شبلی کو بھی اس مضمون سے کافی رنج ہوا اور انھوں نے ایک نظم میں اس کا بھرپور جواب بھی دیا ہے۔ ۷۰

ترک سے حضرت آغا نے یہ ارشاد کیا — کیوں ہو بے فائدہ یورپ میں گرفتار الم
ایشیا میں اگر آجاؤ تو پھر تا بہ ابد — پاؤں پھیلا کے بڑے چین سے سوؤ گے چہ غم
نظر آجائے گی بے کاریِ آلاتِ جدید — جب کہ تم وادیِ تاتار میں رکھو گے قدم ا؎

شبلی کی ان نظموں میں پرسوزی اور واقعات کی حقیقت نگاری نے مسلمانان ہند کی سیاسی جدوجہد میں ایک ایسا تموج پیدا کیا جس سے مسلمانوں کی زندگی کے منہاج تبدیل ہو گئے۔ یہ شاعری صرف جذبات کی ترجمانی نہیں تھی بلکہ اس میں ملی شعور کا بیان بھی تھا۔ دعوت عمل تھی اور ناموس اسلام کی خاطر قربانی دینے کے لیے کوشش و عمل کا جذبہ تھا۔ شبلی نے فرنگی چالوں سے نکلنے کی تلقین کی اور ہمت و بہادری کے جذبات کو مہمیز دی۔۲؎

اکبرالہٰ آبادی: (۱۹۴۲ء۔۱۹۲۱ء)

حالی اور شبلی نے جس بنیاد پر اپنی شاعری کی اسے تکمیل کے درجے پر اکبرالہٰ آبادی نے پہنچایا ہے۔ اکبر نے اپنی غزلوں، نظموں میں انگریزی تہذیب، ان کی سیاست، ان کی چالوں کا خوب مذاق اڑایا ہے۔۳؎ انھوں نے مسلمانوں کو اپنی شاعری میں ہندوستانی ماحول سے الگ تھلگ رہ کر بھی دیکھا اور مدغم کر کے بھی۔ ان کی شاعری حقیقتاً اس دور کے سیاسی، تہذیبی اور تحریکی مزاج کی آئینہ دار ہے۔

اکبر کے اس قسم کے اشعار کے خلاف حکومتی ادارے تادیبی کارروائی بھی کرتے اور دھمکیاں بھی دی جاتیں اور انھیں اس بات کا پابند کیا جاتا تھا کہ وہ ایسے اشعار کہنا بند کر دیں ورنہ ان کی پنشن بند کر دی جائے گی۔۴؎ اکبر کے سیاسی عقیدے میں ترقی کا اصل مدار حصول قوت تھا۔ ان کا بنیادی مسلک یہ تھا کہ سیاسیات نام ہے توازن قوت کا، جو قوم جس قدر قوی ہوگی اسی قدر دوسروں کے مقابلے میں ممتاز ہوگی۔۵؎

اکبر نے اپنی غزلوں میں کم جب کہ نظموں اور قطعات میں زیادہ انگریزوں پر تنقید کی ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ گوری قوم کو کھلے بندوں آزادی ہے کہ جہاں چاہیں قابض ہو جائیں اور یورپی طاقتیں ان کی حوصلہ افزائی بھی کرتی ہیں۔ مثلاً بلغاریہ، سرویا، رومانیہ اور یونان اگر ترقی کی راہ پر چلیں تو یہ ان کا حق ہے لیکن اگر ترک، عرب، ایرانی و افغانی محض اپنی کمر کسنا چاہیں تو یورپ کا گوشہ گوشہ چیخ اٹھتا ہے اور پان اسلامزم کا ہوا کھڑا کر کے مسیحی سلطنتیں مسلمانوں کو مٹانے کے درپے نظر آتی ہیں۔۶؎ یہ نقطۂ نظر اکبر کی غزلوں میں بھی نظر آتا ہے:

خبر دیتی ہے تحریکِ ہوا تبدیلِ موسم کی — کھلے ہیں اور ہی گل زمزمے بلبل کے کم ہوں گے
عقائد پر قیامت آئے گی ترمیمِ ملت سے — نیا کعبہ بنے گا مغربی پتلے صنم ہوں گے
گذشتہ عظمتوں کے تذکرے بھی رہ نہ جائیں گے — کتابوں ہی میں دفن افسانہ جاہ و حشم ہوں گے ۷؎

اکبر کی غزلوں میں چوں کہ اتحادِ اسلامی کے جذبات کم ہی ملتے ہیں۔ مگر ان کی نظموں اور قطعات میں اتحاد اسلامی کے رجحانات نہایت گہرے ہیں۔

اکبر کی شاعری ہندوستانی معاشرے میں عیسائی مشنریوں کے کردار پر بھی طنز کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس طنز میں ایک پیغام پوشیدہ ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کو سختی سے اتحاد کا درس دیا ہے تاکہ صلیب و ہلال کی کش مکش میں مسلمانوں کی کوششیں آپس کے افتراق سے بے کار نہ ہو جائیں:

گنتی میں زیادہ نہیں ہے قول مرا ایک — بے خوف میں کہتا ہوں اسے یعنی خدا ایک
تثلیث کے قائل نے بھی خالق کو کہا ایک — تھی تین پہ سوئی، مری ہیبت سے بجا ایک
یارب رہے جمعیت مسلم یونہی قائم — رخ ایک رسول ایک کتاب ایک خدا ایک ۷۸

عیسائی دنیا کی یلغار مسلمانوں پر صرف حربی نہیں تھی بلکہ انھوں نے مسلمانوں کے شعائر کا بھی مذاق اڑایا اور کچھ ایسے ابہام بھی جنم دیے جو بے بنیاد تھے مگر سادہ لوح مسلمانوں کے دلوں میں اس سے شکوک پیدا ہو گئے:

شیخ مائل ہوئے ہیں ساغر و مینا کی طرف — برکتیں نشہ میں لائیں گی کلیسا کی طرف ۷۹

شاعری کے علاوہ اکبر کے نثر پارے بھی اتحاد اسلامی کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ پانیر میں جو خبریں ترکی کے حوالے سے شائع ہوتی تھیں ان خبروں پر انھوں نے ہلکا پھلکا طنز بھی کیا ہے۔ ان کا ایک نثر پارہ تھسلّی کی دست برداری پر ہے۔ اس میں انھوں نے پانیر کے رپورٹر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''رپورٹر کے تار، تارِ عنکبوت سے کم نہیں ان سے اخذ نتائج کرنا نادانی ہے۔ کل خبر لکھی کہ سلطان نے شرائطِ صلح منظور کر لی ہیں آج فرماتے ہیں کہ شرائطِ صلح کی نسبت بحث کے لیے آئندہ تاریخ مقرر ہوئی ہے۔ اگر شرائطِ صلح منظور ہو گئیں تو پھر بحث کیسی۔۔۔''

آگے چل کر اکبر نے اسی شذرے میں لکھا ہے کہ:

''خدا جانے یہ بیان کہاں تک صحیح ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ یونان ایسے ٹٹ پونجیے سے کچھ چھیننا سلطان خلاف شان سمجھتے ہوں گے، بقائے عظمت کے لیے اس کو نیچا دکھا دینا کافی تھا سو یہ بات ہو گئی۔'' ۸۰

کہاں کا ایپرس کیسی تھسلّی — تمھیں ٹھونکا، ہوئی دل کو تسلی ۸۱

اسی طرح ایک اور شذرے میں پانیر پر طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''ترکی سلطنت سلاطینِ یورپ کے عدم اتفاق سے بچی جاتی ہے میں کہتا ہوں کہ کرۂ ارض کواکب کے کشش باہمی سے بچا جاتا ہے ورنہ اس کا پتا بھی نہ لگتا۔'' ۸۲

اسی اخبار کے ایک رپورٹر پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''پانیر اخبار کا ایک نامہ نگار لکھتا ہے کہ ترکی سلطنت کو ضرور زائل کر دینا چاہیے۔ جب تک ایسا نہ ہوگا مسلمانوں کی بے چینی نہ جائے گی۔ میں کہتا ہوں کہ اس کی کوشش ۱۴۵۳ء سے ہو رہی ہے آپ دعا کیے جائیے، رہی مسلمانوں کی بے چینی وہ کبھی کبھی آپ کی حماقت سے ہو جاتی ہے۔''۸۳

اکبر ۱۸۷۷ء میں روس اور ترکی کی جنگ جسے جنگ پلونا کے نام سے بھی جانا جاتا ہے کے بارے میں ایک جنگ نامہ لکھا تھا اس جنگ نامے میں کئی مقامات اور تاریخی واقعات کا ذکر کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی روسی افواج کو ترکوں کے مقابلے مین بزدل قرار دیا ہے۔

اس جنگ نامے میں اکبر کا کہنا ہے کہ بہادری وہی ہے جو خود غرضی سے پاک ہو، جو بے کسوں پر زبردستی نہ کرے جیسا کہ روسیوں کا قاعدہ تھا کہ بچوں اور بوڑھوں کو بھی انتقام کی آگ میں جلا کر خاک کر دیتے تھے۔۸۴ اس جنگ نامے میں ترک وروس کا موازنہ کیا ہے کہ حالتِ جنگ میں ان دونوں ممالک کے کردار و اخلاق کس نوع کے ہوا کرتے تھے ایسا لگتا ہے کہ اکبر نے باکمال مصور کی طرح اس جنگ نامے میں وہ اثر و جذبات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جو ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات کی عکاسی کرتے تھے۔ غازی عثمان پاشا کی بہادری و عظمت کو ان اشعار میں عقیدت و محبت کے ساتھ بیان کیا ہے:

سنو جنگ دو شنبہ کی اب خبر — مقام پلونا پہ رکھو نظر
وہ عثمان پاشا جوان و دلیر — جو ہے اس نیستاں میں مانند شیر
عدو اس پہ جب حملہ آور ہوئے — تباہ و پریشاں سراسر ہو ئے
سپہ ان کی بس ہو گئی منتشر — کہ باضابطہ روس بھی ہے مصر۸۵

اس جنگ نامے میں رزم، بزم، دعا، موازنہ، جنگ، شکست سب اپنی جگہ بے نظیر ہیں۔۸۶ ان خصوصیات کے ساتھ تحریک اتحاد اسلامی کے نظریے اور سوچ کا بھی اظہار کر رہے ہیں۔ اس جنگ نامے میں وہ ٹکڑا جہاں بروج اور ستاروں سے معرکۂ رزم فضائے آسماں میں دکھایا گیا ہے وہ 'اسد و ثور' کا مقابلہ ہے۔۸۷ اس مقابلے کا منظر نامہ یوں پیش کرتے ہیں۔

سنو حالت جنگِ ارمینیا — جو ہے داخلِ کشورِ ایشیا
وہ میکاف وہ جنرلِ نامدار — کہ جو سارے یورپ کا تھا افتخار
وہ جس پر بہت روسیوں کو تھا ناز — جو مشہور تھا خیلہ جو فتنہ ساز
جو مختار پاشا سے کھا کہ شکست — پریشان تھا صورت فاقہ مست
معین اس کی پھر آئی تھیں پلٹنیں — کہ چودہ جو ہوتی تھیں تعداد میں

ملے توپ خانے بھی سن اس کو تین | کسی پھر بھی ظالم نے گھوڑے پہ زین
جو ہے دل میں بے عزتی کی امنگ | پھر آیا ہے وہ سوئے میدانِ جنگ
خدا جانے کیا موقعۂ جنگ تھا | لڑائی کا کیا رنگ کیا ڈھنگ تھا
ابھی تک نہیں آئی اس کی خبر | کہ کس کو عطا کی خدائے ظفر ۸۸

اس پورے جنگ نامے میں ترکی سلطنت جن جن یورپی قوتوں سے نبرد آزما رہی اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ان ہی یورپی قوتوں کا ذکر کرتے ہوئے ایک مقام پر ترکوں کے حوالے سے کہتے ہیں کہ:

مددگارِ ترکاں ہو پروردگار | کہ دوچار ہیں دوست دشمن ہزار
ادھر سرویا مائل سر کشی | ادھر مونٹی نگرو میں یہ برہمی
بغاوت میں مصروف رومیلیا | شرارت پہ آمادہ بلگیریا
غرض صوبہ ہائے مسیحی تمام | ہیں اعدائے ترکانِ عالی مقام
ادھر خانگی مفسدوں کا یہ رنگ | ادھر حضرتِ روس سرگرمِ جنگ
ہے یہ محض تائید فضلِ اللہ | کہ خوش حال اب تک ہے ترکی سپاہ ۸۹

یہ جنگ نامہ کلیاتِ اکبرالٰہ آبادی کے نسخے میں موجود نہیں ہے۔طالب الٰہ آبادی نے اپنی کتاب اکبرالٰہ آبادی میں اسے شائع کیا ہے۔اس نظم کے علاوہ انھوں نے اس کتاب میں ولفرڈ اسکاؤن بلنٹ کی کتاب کا جو ترجمہ اکبر نے کیا تھا اس کے کچھ اقتباسات بھی پیش کیے ہیں۔یہ اقتباسات زیادہ تر ان کے مقدمے سے لیے گئے ہیں۔ترجمے کے مقدمے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اکبر نے اس وقت کی عالمی صورت حال پر نہ صرف نظر رکھی ہوئی تھی بلکہ یورپ کے جارحانہ رویے کو مسلمانوں پر ظاہر کرنا چاہتے تھے، وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''مصنف نے جو خیالات ظاہر کیے ہیں وہ ہمارے حسب مراد ہوں یا نہ ہوں، ان کی صحت تمام تر لائق تسلیم ہو یا نہ ہو، ایسے نہ تھے کہ مجھے مسلمانوں کی اطلاع کے لیے اس کے ترجمہ کا شوق پیدا نہ ہوتا۔مجھ کو امید ہے کہ میں نے اپنا وقت ضائع نہیں کیا اگر سوچنے والی طبیعتوں کے دائرہ خیال کو وسیع کرنے کے لیے کچھ محنت اٹھائی اور اسلام کی مجموعی پالیٹیکل اور مذہبی حالت کی نسبت انگلستان کے ایک عالی مرتبہ اور ذی علم شخص کی رائے سے ان کو مطلع کیا، تو برا نہیں کیا۔'' ۹۰

ولفرڈ اسکاؤن بلنٹ نے اپنی کتاب کے آغاز میں ایک عربی شعر لکھا ہے جس کا ترجمہ اکبر نے کیا ہے۔وہ شعر یہ ہے:

نہ ہو تو مایوس و دل شکستہ بکھر گئے ہیں اگر یہ موتی | زیادہ تر حسنِ عمدگی سے گوندھیں گے بار دگر یہ موتی ۹۱

بلنٹ کی کتاب تاریخی اور سیاسی نوعیت کی ہے ساتھ ہی اتحاد اسلامی اور ترکوں کے حوالے سے کئی اہم چیزیں اس میں موجود ہیں۔ اکبر کا کہنا تھا کہ:

''اب بھی مجھ کو اسلام کی آئندہ حالت پر ویسا ہی اعلیٰ درجہ کا تیقّن اور بھروسا ہے جیسا کہ ۱۸۸۲ء کی فصلِ بہار میں تھا اور اگر چہ لوگوں کو نخلِ امید سے پھل پانے میں کچھ تاخیر ہوگئی لیکن میں بددل نہیں ہوں گو سردست ناکامی ہوئی ہے لیکن ہم کو خدا پر بھروسہ اور یقین رکھنا چاہیے۔''۹۲

یہی وہ پہلو ہے جو ان کے اس جنگ نامے میں بھی سامنے آیا ہے۔ جنگ نامہ اودھ پنچ میں ۱۸۷۷ء میں چھپا تھا اس میں ترکوں سے جو لگاؤ ظاہر ہوا ہے اور ان کی بہادری کا جو ذکر کیا گیا ہے اس سے اکبر کی محبت و عقیدت بھی ظاہر ہوتی ہے۔ ترکوں کی بہادری کا ذکر کرتے ہوئے ان کا کہنا ہے کہ:

یہ سب کچھ ہے حاصل تجھے میں گواہ — مگر جنگ ترکاں خدا کی پناہ
یہ زیرِ فلک ہے وہ قوم دلیر — کہ غصہ سے دیکھیں تو ڈر جائے شیر
اگر کوہ سے ہوں یہ سرگرمِ جنگ — اڑیں ہوش کی طرح ذرّاتِ سنگ
بہادر ہیں منصف ہیں دیں دار ہیں — دلاور ہیں مر نے پہ تیار ہیں ۹۳

اکبر الٰہ آبادی کی ایک نظم ''جنگ ترکی اور اٹلی کے متعلق رائیں'' ہے۔ اس نظم میں اس جنگ کے حوالے سے ہندوستان میں برپا مختلف آرا کو نظم کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ اکبر کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ ملت کو غیرتِ ایمانی کے ذریعے سے بچایا جاسکتا ہے۔ آج ہمارے معاشرے میں نفس کی غلامی نے ہماری دلیری کو بزدلی میں تبدیل کر دیا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اللہ کا ہو کر باطل قوتوں کا مقابلہ کیا جائے۔ ترکی میں برپا انقلاب کو اکبر اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے ان کا تجزیہ یہ تھا کہ اس انقلاب کے ذریعے ترکی کی معاشرت تیزی سے مغرب زدہ ہو جائے گی۔ اس بارے میں انھوں نے وہی رویہ اختیار کیا جو علی گڑھ تحریک کے حوالے سے تھا اور اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ بعد کے حالات نے ان کے اس زاویے کو درست کر دکھایا:

دکھائے گی نیا اب رنگ ترکی — نہ ہوگی مبتلائے جنگ ترکی
وہاں بھی آگئیں مغرب کی لہریں — ہوئی اب ہم کنار گنگ ترکی
بہت خود رائے تھے سلطان سابق — رہا کرتی تھی ان سے تنگ ترکی
ہوئے رخصت وہاں سے اولڈ فیشن — ترقی اب کرے گی ینگ ترکی ۹۴

یہاں پر نوجوان ترک کے انقلابیوں پر اکبر الٰہ آبادی نے طنز کیا ہے اکبر چوں کہ خلافت کو اور مسلمانوں کے مذہبی اداروں کو

بہتر سمجھتے تھے اس لیے ان پر طنز کیا جانا فطری ہے اس نظم میں اکبر نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

کیا بحث ہے ایران سے یا ترک و عرب سے — اس وقت تجھے قطع نظر چاہیے سب سے
یا تخت پہ بیٹھے کوئی یا تخت سے اترے — رکھ کام تو دن رات فقط طاعت رب سے
تاریخ نے دیکھے ہیں بہت رنگ فلک کے — خورشید نکلتا ہے سدا پردہ شب سے ۹۵

مسلمانوں میں اتحاد بین المسلمین کے جذبے کی کمی کا شکوہ اس انداز سے کرتے ہیں:

غضب ہے حُبِ اسلامی سے خالی سب کا سینا ہے — کہ حد سے ناتواں بینی ہے بے مہری ہے کینا ہے
بس اپنے ہی مزے کے واسطے ہر اک کا جینا ہے — یہی قومی ترقی کا ذرا سوچو تو زینا ہے؟ ۹۶

اکبر کی شاعری ملی احساس کی آئینہ دار ہے۔ ان کی غزلوں، نظموں اور قطعات میں کرب اور طنز کا جو پہلو ملتا ہے وہ مسلمانوں کی ملی شکست کو نمایاں کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ان کے ایک قطعے میں مغرب اور مسلمانوں کے مابین جاری کش مکش کو یوں نمایاں کیا جا رہا ہے:

اک مسِ سیمیں بدن سے کر لیا لندن میں عقد — اس خطا پر سن رہا ہوں طعنہ ہائے دل خراش

اس شعر کے بعد جو حال یورپ کی تہذیب پر عمل کرنے والوں کا ہوتا ہے اسی قطعہ میں اس کی منظر کشی کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ مغرب کا نظام مسلمانوں کے ایمان اور یقین کو ڈگمگا دیتا ہے اور جب ایمان پر ایقان اٹھ جاتا ہے تو پھر گناہ کرنا آسان ہو جاتا ہے:

بادہ تہذیبِ یورپ کے چڑھاؤ خُم کے خُم — ایشیا کے شیشہ تقویٰ کو کردو پاش پاش
جب عمل اس پر کیا پریوں کا سایا ہو گیا — جس سے ہے دل کی حرارت کو سراسر انعاش ۹۷

اکبر الٰہ آبادی نے ایک قطعہ ''سلطنت نہ سہی رہو تو مل جل کر'' میں مسلمانوں کو متحد رہنے کی تلقین کی ہے۔ کہتے ہیں کہ:

درخت جڑ پہ ہے قائم تو استوار بھی ہے — کبھی خزاں ہے جو اس پر کبھی بہار بھی ہے
نگاہِ غور کرو سوئے ترکی و ایراں — نئی بنا پہ حریفوں نے کر دیے ویراں ۹۸

یعنی ترکی و ایران کبھی مسلمانوں کی دو بڑی سلطنتیں تھیں۔ جب سے ان قوموں میں نئی تہذیب کی روح پھونکنے کی کوشش شروع ہوئی ان کی حالتیں اسلامی نقطۂ نظر سے روز بروز بدتر ہوتی جا رہی ہیں اور ان کا وجود ہر طرح سے تباہ ہوتا جا رہا ہے۔ نئی قوتوں کے پنپنے کی صلاحیت ان میں ختم ہو گئی ہے۔ ۹۹ اکبر نے اس قطعے کے آخر میں مسلمانوں کو متحد رہنے کا مشورہ دیا ہے:

جو بات ٹھیک ہے کہتا ہوں میں اسے کھل کر — کہ سلطنت نہ سہی تم رہو تو مل جل کر ۱۰۰

''مشرق و مغرب کا یارانہ'' کے عنوان سے قطعہ میں اکبر نے ان دونوں خطوں کی آویزش کو نہایت عمدہ انداز میں پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ دونوں خطے روش کے اعتبار سے ایسے ہیں کہ ان کا ملنا ناممکن ہے:

بہت مشکل ہے نبھنا مشرق و مغرب کا یارانہ ادھر صورت فقیرانہ ادھر سامان شاہانہ
یہ یونی ورسٹی کا مسئلہ کیا کم تھا اے گردوں کہ چھیڑا تو نے ہم دم ترکی و اٹلی کا افسانہ [۱۰۱]

اس آخری شعر میں اس بات کی جانب اشارہ ملتا ہے کہ علی گڑھ میں مسلم یونی ورسٹی کے قیام کے حوالے سے ہندوستان میں ایک ہیجان برپا تھا۔ اس کے ساتھ جنگ طرابلس نے ہندوستانی مسلمانوں کو اور زیادہ برانگیختہ کر دیا اور پورے ملک میں اس حوالے سے احتجاج شروع ہو گیا۔[۱۰۲] اس میں اکبر نے اپنے نظریاتی اختلافات کو پس پشت ڈال کر علی گڑھ کو یونی ورسٹی کا درجہ دیے جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ وہ مسلمانوں کے ملی معاملات سے کبھی لاتعلق نہیں رہے یہی وجہ ہے ان کے کلام میں اہم ترین واقعات جو ہندوستان اور ترکی میں برپا ہوئے اس حوالے سے شعری مثالیں باآسانی مل جاتی ہیں۔

اکبر الٰہ آبادی نوجوان ترکوں کو پسند نہیں کرتے تھے سلطان عبدالحمید کی معزولی پر انھوں نے نہایت رنج کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ ترکی سلطنت نے اب عیسائی چولا پہن لیا ہے۔[۱۰۳] اکبر نے سلطان عبدالحمید اور زار روس کی معزولی کا ایک جگہ موازنہ کیا ہے:

جو زار روس اترے تخت سے ان کا یہ شکوا تھا انھیں نے دی دغا ہم کو ہمیں جن پر بھروسا تھا
انھیں قولوں نے کھینچا عبرت و حسرت کا نقشا بھی انھیں سے ہے عیاں طرز خیال دین و دنیا بھی [۱۰۴]

زار روس کو ۱۹۱۷ء میں ایک بغاوت کے نتیجے میں مع خاندان قید کر لیا گیا تھا اور پھر انھیں گولیوں سے اڑا دیا گیا۔ سلطان عبدالحمید نے اپنی معزولی کے وقت کہا تھا کہ مشیت الٰہی یہی ہے جب کہ زار روس نے جن پر بھروسہ کیا تھا وہی غدار نکلے۔ عبدالحمید کو اپنی معزولی سے عبرت حاصل ہوئی جب کہ زار روس کو حیرت و پشیمانی۔ عبدالحمید کا رویہ دین دارانہ تھا۔[۱۰۵]

مولانا محمد علی جوہر: (۱۸۷۸ء۔۱۹۳۱ء)

مولانا محمد علی جوہر کا شعری سرمایہ مقدار میں زیادہ نہیں ہے۔ اس میں بیش تر غزلیات ایسی ہیں جنھیں ملی شاعری میں شمار کرنا درست نہیں ہوگا مگر ان کی غزلوں میں کئی ایسے اشعار نظر آتے ہیں جن میں جوہر کا کرب نہ صرف برعظیم پاک و ہند بلکہ ملت اسلامیہ کے لیے واضح طور پر سامنے آتا ہے۔[۱۰۶]

جوہر چوں کہ خود بھی ملی احساس اور اتحاد بین المسلمین کے پیغامبر تھے اس لیے ان کی شاعری میں وہ تمام رجحانات جو اس وقت امت مسلمہ کو درپیش تھے آشکار ہوئے ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری میں مسلمانوں کو حزن و ملال سے منع کیا ہے اور امید کا پیغام دیا

ہے کہ اگر محنت و عمل کو شعار بنایا جائے تو مسلمان دوبارہ اپنے بکھرے ہوئے شیرازے کو محفوظ بنا سکتے ہیں۔

جوہر نے جب ۱۹۱۱ء میں کلکتہ سے کامریڈ جاری کیا تو ہندوستان کی فضا سیاسی اعتبار سے انقلاب کی جانب قدم بڑھا رہی تھی۔ ایک جانب اسلامی ممالک کی تباہی ہندوستانی مسلمانوں کو بے کل کر رہی تھی تو دوسری جانب یورپ کے جارحانہ اقدام نے مسلمانوں کو اتحاد بین المسلمین کی جانب راغب کر دیا تھا۔ جب ترکوں نے ایڈریانوپل پر دوبارہ قبضہ کر لیا تو عالم اسلام کی خوشی دیدنی تھی۔

جب یہ خبر دہلی پہنچی تو رات کافی ہو چکی تھی۔ مولانا کی ترکوں سے محبت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے صبح ہونے کا انتظار بھی نہیں کیا۔ اپنے چند رفقا کو لے کر سیدھے جامع مسجد دہلی پہنچے اور راستے میں چلا چلا کر مسلمانوں کو یہ خوش خبری دیتے رہے آخر مسجد میں ایک مجمع جمع ہو گیا اور پھر جوہر نے ایک دردانگیز تقریر کی جس میں یورپ کی شاطرانہ چالوں کو بے نقاب کیا گیا[۱۰۷]۔

اٹلی نے جب طرابلس پر حملہ کر دیا تو مسلمانوں کی شکست کی خبر نے مولانا محمد علی جوہر کو بے چین کر دیا تھا۔ انھوں نے اس اضمحلال میں خودکشی کا ارادہ کر لیا تھا۔ اپنی خودنوشت سوانح حیات میں لکھتے ہیں کہ:

> ''طرابلس کی اس تباہ کن جنگ کے دوران میرے جذبات اتنے شدید تھے کہ میں اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ ایک دن میں نے اس سے مغلوب ہو کر خودکشی کا ارداہ کر لیا تھا۔ ۱۹۱۲ء کے موسم خزاں کی اس رات مجھے اپنی ہمت اور بزدلی کی آزمائش سے میرے ایک مسلمان دوست کی آمد نے بچا لیا۔''[۱۰۸]

۱۹۱۴ء میں *London Times* میں *The Choice of the Turks* کے عنوان سے ایک مضمون لکھا[۱۰۹]۔ اس مضمون میں ترکوں کو سخت لہجے میں تنبیہہ کی گئی تھی کہ وہ جنگ میں جرمنی کا ساتھ نہ دیں اسی مضمون کی پاداش میں انھیں چھنڈوارہ جیل میں پانچ سال کے عرصے کے لیے قید کر دیا گیا[۱۱۰]۔ جوہر کے اخبار کامریڈ نے ترکی کی مدد کے لیے چندہ جمع کرنے کی مہم شروع کی اور جوہر کی مستعدی سے اس رقم کو زخمی سپاہیوں اور مجروحین جنگ میں تقسیم کرنے کے لیے آٹھ رکنی وفد روانہ کیا گیا۔[۱۱۱]

جوہر کی شاعری زبان و بیان کی نزاکت کے ساتھ شاعرانہ پیوندکاری سے لبریز ہے اسی لیے ان کی شاعری میں افسوس کے اظہار کے بجائے سرمستی عمل اور لذت کردار نظر آتی ہے۔ انھوں نے اپنے اشعار میں مجاہدانہ ولولے کو خصوصی جگہ دی ہے[۱۱۲]۔ جوہر نے اپنی شاعرانہ طبیعت کے بارے میں اظہار کیا ہے کہ:

> ''لکھنے کے لیے نہ بیٹھتا ہوں نہ کوشش کرتا ہوں مگر جب طبیعت پر خود ہی کسی بیرونی تحریک کا غلبہ ہوتا ہے تو بہ غایت مجبوری کہہ لیتا ہوں اس سے خود مجھے کچھ نہ کچھ تسکین ہو جاتی ہے مگر میری شاعری کو لٹریچر سے کیا تعلق یہ صرف دست افشانی اور پاکوبی کے لیے ہے۔''[۱۱۳]

۱۸۹۸ء میں ان کی ایک غزل جس میں بادہ و ساغر کے ساتھ ساتھ حق و باطل کا معرکہ یوں بپا ہے:

اب کہیں ٹوٹا ہے باطل کا طلسم　　حق کے عقدے اب کہیں ہم پر کھلے
فیض سے تیرے ہی اے قید فرنگ　　بال و پر نکلے قفس کے در کھلے [۱۱۴]

جوہر ہندوستان کی ملت اسلامیہ کے ملی خصائص اور مزاج کا نقطۂ عروج تھے۔[۱۱۵] جوہر کے دل میں عالم اسلام کے مسلمانوں کے لیے بے کراں محبت کا جذبہ تھا۔ان علاقوں کے مسلمانوں سے انھیں خاص لگاؤ تھا جو مغربی اقوام کی ہوس ملک گیری کی زد پر تھے۔ترکوں کی کھل کر جس طرح جوہر نے حمایت کی تھی اس کے اثرات ہندوستان میں ظاہر ہوئے۔[۱۱۶] جوہر کے اس جرأت مندانہ کردار نے انھیں ترکوں کے حلقے میں خاص کر نوجوان ترکوں میں متعارف کرایا۔جوہر نے ہندوستانی مسلمانوں کو یہ باور کرایا کہ عالم اسلامی میں ہم آہنگی موجود ہے۔یہ مسلمان اخوت کے عالم گیر رشتے میں بندھے ہوئے ہیں لیکن ترکوں نے جب سلطنت اور خلافت ختم کردی تو انھیں یہ سمجھ نہیں آیا کہ وہ اپنی مایوسی اور اذیت کو کیسے چھپائیں۔[۱۱۷]

فتح سمرنا کے موقعے پر جوہر چوں کہ جیل میں تھے مگر اس زمانے میں انھیں اندازہ ہو گیا تھا کہ ترکوں نے یونانی غرور کو خاک میں ملا دیا۔اس پر انھوں نے جو غزل کہی اس کا انداز کچھ یوں ہے:

عالم میں آج دھوم ہے فتحِ مبین کی　　سن لی خدا نے قیدیِ گوشہ نشین کی
ہیں سب عرب میں شام، فلسطین اور عراق　　ہے شرط جس کے واسطے صرف ایک حسین کی [۱۱۸]

مولانا محمد علی جوہر کی شاعری اس لیے بھی اہم ہے کہ انھوں نے سیاسی شاعری کے امکانات کو وسعت بخشی، چوں کہ ان کے یہاں مذہب اور سیاست ایک چیز نہیں ہے اس وجہ سے انھوں نے اپنی شاعری میں مذہب کے جذبے سے صداقت حاصل کی ہے اور اس کی وسیع تاریخ سے بھی استفادہ کیا ہے۔[۱۱۹] مذہب اور مذہبی تاریخ سے اخذ کردہ علامتوں نے جوہر کی غزل کو وسعت بخشی ہے۔ایک ایسی وسعت جو خالص سیاسی عناصر کے بس کی بات نہیں ہے۔[۱۲۰] یہی وجہ ہے کہ جوہر کی غزل میں موجود سیاسی عناصر نے شاعری کی روایت میں سیاسی رجحان کو اعتبار بخشا۔[۱۲۱] ترکوں کے ساتھ جو جذبہ ہندوستانی مسلمانوں میں موجود تھا جوہر کی شاعری بھی اس سے مبرا نہیں ہے:

آخر کو لے کے عرش سے فتح و ظفر گئی　　مظلوم کی دعا بھی کبھی بے اثر گئی
اگلی سی اب وہ زعم کی طغیانیاں کہاں　　شب بھر میں کیا چڑھی ہوئی ندی اتر گئی
عالم کا رنگ اور سے کچھ اور ہو گیا　　ہم بے کسوں کی آہ عجب کام کر گئی [۱۲۲]

جوہر نے اپنی ایک غزل میں جو لب و لہجہ اختیار کیا اس کے اشعار آج بھی حق و باطل کے معرکے میں ذوق و شوق سے پڑھے جاتے ہیں اس غزل کو ان کی شاعری کا حاصل کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا:

دور حیات آئے گا دور قضا کے بعد ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد
قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد ۱۲۳

ایک اور غزل میں مسلمانوں کی بے توقیری کا اظہار کیا گیا ہے:

خوگرِ جور پہ تھوڑی سی فضا اور سہی اس قدر ظلم پہ موقوف ہے کیا اور سہی
کشورِ کفر میں کعبہ کو بھی شامل کر لو سیرِ ظلمات کو تھوڑی سی فضا اور سہی ۱۲۴

سامراجی قوتوں کے سامنے جو ہر مزاحم کا رہے ہیں اسی لیے ان کی شاعری میں اس مزاحمت کے واضح اشارے موجود ہیں ان کا کہنا ہے کہ:

تم یوں ہی سمجھنا کہ فنا میرے لیے ہے پر غیب سے ساماں بقا میرے لیے ہے
پیغام ملا تھا جو حسین ابن علی کو خوش ہوں وہی پیغام قضا میرے لیے ہے
توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے یہ بندہ زمانے سے خفا میرے لیے ہے ۱۲۵

مولانا محمد علی جوہر کا کلام زیادہ تر محبوسیات کے تحت آتا ہے جو انھوں نے چھنڈواڑہ جیل میں قیدی کی حیثیت سے لکھا ہے۔ ان کے کلام میں اتحاد بین المسلمین، صبر و رضا اور تائید حق کے جذبات ملتے ہیں اور جبر و استبداد کی قوتوں کے مقابلے میں کلمہ حق کو جس طرح انھوں نے اپنی زندگی میں بلند کیا وہی ان کی شاعری میں بھی جھلکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ۱۲۶

ہندوستانی مسلمانوں میں برطانوی سامراج اور جبروتی قوتوں کے خلاف جن رہ نماؤں نے مساعی و تلقین کی ہے جوہر کا نام ان میں نمایاں نظر آتا ہے۔ ایک جگہ اپنی شاعری کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

''میری غزلوں کی تعریف اکبر الہ آبادی فرمائیں یا کوئی اور، مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ ادب میں داخل نہیں ہیں۔ محض میرے درد کی آواز ہیں دیکھیے کب تک رہے۔'' ۱۲۷

مولوی اسمٰعیل میرٹھی:

اسمٰعیل میرٹھی بچوں کی نفسیات کے ماہر تھے اس لیے ان کی نظمیں نصابی کتب میں مقبول ہوئیں۔ ۱۲۸ مگر انھوں نے مسلمانوں کی پستی کا نقشہ اپنی نظموں میں نہایت عمدگی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اسمٰعیل میرٹھی نئی تہذیب اور نئے علوم کو پسند کرتے تھے اور سائنسی علوم کی قدروں کا انھوں نے خیر مقدم بھی کیا۔ علی گڑھ تحریک سے وابستہ تھے مگر زوال امت کا احساس ان کی نظموں میں جا بہ جا دکھائی دیتا ہے۔ اپنی نظم جریدہ عبرت میں مسلمانوں میں موجود خرابیوں کا ذکر کیا ہے، رسوم بد کا تذکرہ اور کردار کی خرابیوں کو پیش کیا ہے۔ اسلام کی عظمت اور خوبیوں کو گنایا ہے۔ ۱۲۹ اسمٰعیل میرٹھی کی ایک اور نظم قلعہ اکبر آباد بہ آثار سلف ۱۸۸۹ء میں کہی گئی ہے جس میں

مغلیہ سلطنت کا جاہ وجلال، زمانۂ حال میں مسلمانوں کی پستی اور انحطاط کی طرف اشارہ ہے۔ اسلاف کے کارناموں کو پیش کرتے ہو ئے نئی نسل کے نوجوانوں کو اس بات کی تلقین کی گئی ہے کہ وہ عزم واستقلال کا ایندھن انھیں کارناموں سے حاصل کریں۔ ۱۳۰ اس پوری نظم میں ملت اسلامیہ کی ابتری کا کرب نمایاں ہے:

یارب یہ کسی مشعلِ کشتہ کا دھواں ہے — یا گلشنِ برباد کی یہ فصلِ خزاں ہے
یا برہمی بزم کی فریاد و فغاں ہے — یا قافلۂ رفتہ کا پس خیمہ رواں ہے
ہاں دورِ گزشتہ کی مہابت کا نشاں ہے — بانیِ عمارت کا جلال اس سے عیاں ہے
اڑتا تھا یہاں پرچم ... جاہِ اکبر — بجتا تھا یہاں کوسِ شہنشاہِ اکبر ۱۳۱

مولوی اسمٰعیل میرٹھی نے جنگ روم وروس کے موقعے پر ۱۸۷۸ء میں ترک مجروحین کی مالی امداد کے لیے مسلمانان میرٹھ کے جلسے میں تقریر کی۔ یہ تقریر ''نجم الاخبار'' میں شائع ہوئی تھی۔ اس کی فصاحت کا ذکر ''تہذیب الاخلاق'' میں بھی کیا گیا ہے۔ ۱۳۲ اس سے قبل انھوں نے ایک پوری نظم جنگِ روم وروس کے حوالے سے ۱۸۷۷ء میں لکھی۔ اس نظم میں انھوں نے ملت اسلامیہ کے تصور کو نمایاں کرتے ہوئے ترکوں کی بہادری اور شجاعانہ کردار کی بہت تعریف کی ہے۔ یہ مثنوی روم وروس کی جنگ کے حوالے سے اسمٰعیل میرٹھی کے جذبات کی عکاس ہے:

حالاتِ روم و روس سے دن رات کام ہے — اخبار کا ورق نہیں خوانِ طعام ہے
کیسے خیال جنگ میں روزے گزر گئے — معلوم بھی نہیں کدھر آئے کدھر گئے
سوجھا نہ اور کچھ ہمیں اس بھوک پیاس میں — دن کاٹتے رہے انہی خبروں کی آس میں
روزہ خبر بغیر ہمیں بار ہو گیا — آیا جو تار فتح تو افطار ہو گیا ۱۳۳

ترکوں کی بہادری تعریف یوں بیان کی ہے۔

کیا اب بھی ترکتاز میں ترکی سوار ہیں — جن غازیوں کی تیغ سے روسی فگار ہیں
کیا کر رہی ہے احمدِ مختار کی سپاہ — فیروز مند غازیِ جرار کی سپاہ
اے ماہِ نور بارِ سفر میں ہے تو مدام — حالات جنگ کے تجھے معلوم ہیں تمام ۱۳۴

ترکوں کی بہادری اور ان کے کردار کو ہندوستانی تاریخ میں کبھی بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستان کی تاریخ میں مغلوں کا کردار دراصل ترک کردار تھا اور ترکوں کی تمدنی وتہذیبی جھلک ہندوستانی معاشرے کی زندگی میں ہمیشہ موجود رہی ہے۔ اسی لیے اسمٰعیل میرٹھی نے اس جنگ نامے میں ان کی شان وشوکت کو یوں بیان کیا ہے۔

ترکوں کو ایسی شوکت وجاہ و جلال دے | جو زلزلہ غنیم کے لشکر میں ڈال دے
مشرق کی سمت سے ہو سلیمان گرمِ کار | افواجِ زار و ڈچ کو دکھا سے رہِ فرار
بلگیریا میں ختم ہو ہنگامہ جنگ کا | رومانیا نشانہ ہو ترکیَ تفنگ کا
دم بند روسیوں کا ہو صمصامِ ترک سے | بھاگے سپاہِ روس فقط نامِ ترک سے
ترکی سپاہ میں علمِ فتح ہو بلند | پہنچے سپاہِ زار کو آزار اور گزند ۱۳۵

اپنی ایک اور نظم ''ترکی کی یونانیوں پر فتح'' میں کہتے ہیں کہ:

ہاں کیوں نہ ہو دو چند ہمیں عید کی خوشی | فتح عظیم پائی ہے سلطانِ روم نے
سچ کہہ رہا ہوں شک ہو تو پانیر میں پڑھو | کیسی شکست کھائی ہے یونانِ شوم نے
شکرِ خدا ہر ایک مسلمان خوش ہے آج | عیدی کے شعر پڑھ کے لگے ہم بھی جھومنے ۱۳۶

نظم ''جریدۂ عبرت'' میں انھوں نے انگریزی تہذیب وتمدن سے وابستہ لوگوں کا مذاق اڑایا ہے ان کا کہنا یہ ہے کہ ان لوگوں نے جس تہذیب کو اپنایا ہے اس کے نتیجے میں وہ نہ انڈین رہے اور نہ مکمل انگریز بن سکے ان کا مذہبی حال ایسا ہے کہ چرچ اور مسجد دونوں انھیں قبول نہیں کرتے۔ ان لوگوں نے اغیار کی صورت اختیار کر کے اپنی عزت کے گوہرِ درخشاں کو تار تار کر دیا ہے۔ اس نظم کے آخر میں اسمٰعیل میرٹھی نے دعا مانگی ہے کہ خدا مسلمانوں میں دوبارہ شوق جنوں پیدا کر دے کہ وہ علم کے حصول کے لیے راہِ مستقیم اور عقلِ سلیم کو اختیار کر کے جمال صورت ومعنی میں دوبارہ کمال حاصل کریں۔ انگریزی تہذیب کو اپنانے والوں کو کہتے ہیں کہ:

رہا وہ جرگہ جسے چر گئی ہے انگریزی | سو واں خدا کی ضرورت! نہ انبیاء درکار!!
وہ آنکھ میچ کے بر خود غلط بنے ایسے | کہ ایشیا کی ہر ایک چیز پر پڑی دھتکار
جو پوششوں میں ہے پوشش تو پس دریہ کوٹ | سواریوں میں سواری تو دم کٹا رہوار
جو اردلی میں ہے کتا تو ہاتھ میں اک بید | بجاتے جاتے ہیں سیٹی سلگ رہا ہے سگار
وہ اپنے آپ کو سمجھے ہوئے ہیں جینٹل مین | اور اپنی قوم کے لوگوں کو جانتے ہیں گنوار
نہ کچھ ادب ہے نہ اخلاق نے خدا ترسی | گئے ہیں ان کے خیالات سب سمندر پار ۱۳۷

قوم کی سیاسی اور علمی زبوں حالی کا احساس ان کی نظموں میں عام طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ ان کے تمام علمی کارناموں کی غایت اصلاح قوم تھی۔ ان کی نظمیں چاہے وہ سیاسی رجحان کی حامل ہی کیوں نہ ہوں گہرے قومی درد کی آئینہ دار ہیں۔ وہ ان مختلف طبقات کی بے راہ روی اور لاپرواہی پر نکتہ چیں ہیں جو قومی احساس اور اجتماعی شعور سے عاری ہو کر اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔ ۱۳۸

حسرت موہانی: (۱۸۷۵ء۔۱۹۵۱ء)

حسرت موہانی کا شمار ہندوستان کے ان باغی انقلابیوں میں ہوتا ہے جنھوں نے انگریزوں سے مصالحت کرنے کے بجائے آزادی کی خاطر جنگ لڑنے کا ارادہ کیا اور اس ارادے پر پورے اترے[۱۳۹]۔ ۱۹۰۸ء میں انگریزوں کی مصر کے حوالے سے تنقیدی مضمون کو اپنے رسالے ''اردوئے معلّٰی'' میں شائع کر کے بغاوت کا الزام اپنے سر لینے والے حسرت موہانی نے ساری زندگی حق گوئی کو اپنا شعار بنائے رکھا۔

حسرت موہانی بچپن میں ہی مولانا شاہ عبدالوہاب فرنگی محلی جو مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے والد تھے کے مرید ہو چکے تھے۔ بزرگان فرنگی محلی سے خاص تعلق کی وجہ سے حسرت نشیب و فراز کے باوجود اپنی مذہبی زندگی اور صوفیانہ مشرب میں غیر متزلزل رہے[۱۴۰]۔ علماءِ فرنگی محل کا نظریہ اتحاد بین المسلمین ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے عیاں تھا۔ حسرت موہانی کی سیاسی زندگی پر اس کے اثرات بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ انھوں نے اپنے ایک مضمون کی اشاعت اپنے رسالے میں کی تھی اس میں لکھا گیا تھا کہ:

> ''انگریز ہی ترکی کی بربادی کی وجہ ہیں۔ مقدونیہ اور کریٹ کے متعلق انگریز ثالث رہے ہیں۔ وہ ملک کے وجود کو ختم کر دینے کا عزم رکھتے ہیں۔۔۔ کیا اعرابی پاشا جو مصر کی آزادی چاہتا تھا اور نئی روشنی کا خواہاں تھا جو نئے خیالات کا علم بردار تھا، کو جلاوطن کرنا جائز تھا؟''[۱۴۱]

اٹلی نے جب طرابلس پر حملہ کر دیا تو ترکوں اور عربوں نے متحد ہو کر اٹلی کا مقابلہ کیا۔ گھمسان کی جنگ ہوئی۔ یورپی ممالک نے اٹلی کو شہ دینا شروع کر دی۔ جس سے سارے عالم اسلام میں یورپ کے خلاف نفرت اور بے زاری کی لہر دوڑ گئی۔ حسرت نے اس پر یوں اظہار کیا ہے:

قبضۂ یثرب کا سودا دشمنوں کے سر میں ہے — اب تو انصاف اس ستم کا دستِ پیغمبر میں ہے
جورِ یورپ ہے بنا بیداریِ اسلام کی — خیر ہے دراصل یہ حالاں کہ شکلِ شر میں ہے
خاطرِ افسردہ میں باقی ہے اب تک یادِ عشق — گرمیِ آتش ہنوز اس مشتِ خاکستر میں ہے
قلتِ افواجِ ترکی پر نہ ہو اٹلی دلیر — ایک ہے سو کے لیے کافی جو اس لشکر میں ہے
اب خدا چاہے تو حسرت جلد ہوتا ہے بلند — رایتِ حریت و حق جو کفِ انور میں ہے[۱۴۲]

حسرت موہانی اپنے رفقا کے ساتھ شہر شہر ترکوں کی ہم دردی اور سودیشی تحریک کی حمایت میں تقریریں کرتے تھے اور آزادی کے نعرے بلند کرتے ہوئے انجمن خدامِ کعبہ اور ہلالِ احمر کی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔[۱۴۳] عالمِ اسلام کے حوالے سے جنوری ۱۹۱۱ء اور ۱۹۱۳ء کے مابین کئی اہم مضامین شائع کیے۔ جن میں ''پان اسلامزم اور مصر''، ''مسلمانوں پر جنگ اٹلی و ترکی کے

اثرات'' اور ''جنگِ بلقان'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔۱۴۴؎

۱۲دسمبر۱۹۱۲ء کو بلقان کے خلاف ترکی کی ہم دردی میں لکھنؤ شہر میں والیِ رام پور حامد علی خان کی صدارت میں ایک اہم جلسہ ہوا۔اس جلسے میں حسرت موہانی نے برطانوی حکومت کے کردار پر اپنی تقریر میں سخت موقف اختیار کیا، والئی رام پور دم بہ خود جلسے کی صدارت پہ مجبور تھے۱۴۵؎۔ترکی کے خلاف کی جانے والی سازشوں کا اکبر کو علم تھا اور اس حوالے سے ان کی شاعری میں اشارے موجود ہیں:

غضب ہے کہ پابندِ اغیار ہو کر — مسلمان رہ جائیں یوں خوار ہوکر
اٹھے ہیں جفا پیش گانِ مہذب — ہمارے مٹانے پہ تیار ہوکر
تقاضائے غیرت یہی ہے عزیزو — کہ ہم بھی رہیں ان سے بے زار ہو کر
کہیں صلح و نرمی سے رہ جائے دیکھو — نہ یہ عقدۂ جنگِ دشوار ہوکر
وہ ہم کو سمجھتے ہیں احمق جو حسرت — وفا کے ہیں طالب دل آزار ہوکر ۱۴۶؎

انیسویں صدی کے نصف آخر میں اس دور کا تفصیلی مطالعہ کرنے کے بعد جو حقائق سامنے آتے ہیں ان میں ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی بھی شامل ہے جس نے ہندوستانی مسلمانوں کو ہمہ گیر مایوسی سے دوچار کر دیا تھا۔مگر ساتھ ہی اصلاحی تحریکوں او رعالمی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں نے مسلمانوں کے فکر واحساس میں کئی اہم تبدیلیاں پیدا کیں۔ان تبدیلیوں کے نتیجے میں ہماری اردو شاعری قومی وملی احساس کے ساتھ سفر کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

انگریزوں سے نفرت اور اس کی پالیسی کو حقارت کی نظر سے دیکھنا صرف عام مسلمانوں کا ہی رویہ نہیں تھا بلکہ اس سلسلے میں خواص نے بھی اپنی شاعری اور مضامین کے ذریعے عام مسلمانوں میں انگریزوں سے نفرت پیدا کرنے کی شعوری کوشش کی۔

اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ بیسویں صدی کے آغاز میں حسرت موہانی پہلے مسلمان تھے جنھوں نے سیاسی قیدی کی حیثیت سے جیل کو زینت بخشی اور یہ سلسلہ ۱۹۲۳ء تک جاری رہا۔اس پورے عرصے میں حسرت موہانی کا بیش تر کلام سیاسی حالات و واقعات سے بھی متاثر ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ چوں کہ حسرت کے یہ اشعار عاشقانہ مضامین پر مشتمل شعروں کے ساتھ پیوستہ ہیں۔۱۴۷؎ اس لیے یہ مسئلہ ہمیشہ قاری کے سامنے ہوتا ہے کہ اس شعر کا اصل مخاطب کون ہے۔

اصل میں حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے سیاست کو شاعری کا اتنا اہل نہیں سمجھا کہ مستقل عنوان بنا کر کچھ کہتے۔تاہم اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ انھوں نے اپنی سیاسی زندگی کو شاعری میں جا بہ جا بیان کیا ہے۔۱۴۸؎ کئی شاعرانہ پہلوان کے یہاں ایسے ہیں جو راست انگریزوں سے مخاطب ہو کر ان کے کردار کا مضحکہ اڑاتے نظر آتے ہیں۔چھوٹی چھوٹی مترنم بحروں میں سادہ وشگفتہ الفاظ، رواں مصرعے سیاسی موضوع کا اظہار اور بصیرت آمیز خیالات ان میں موجود ہیں۔۱۴۹؎ :

یورپ میں جیسے پھیل گئی ہے وبائے حرص — چلنے لگی ہے سارے جہاں میں ہوائے حرص
ہے چین و کوریا کے مٹانے پہ مستعد — جاپاں بھی ہوا ہے مگر آشنائے حرص ۱۵۰

حسرت ہمیشہ جس جذبۂ حریت کے شیدائی رہے وہ انگریزی حکومت کی نظر میں خطرناک ہی رہا۔ انھیں مسلسل قید کیے جانے کا عمل انگریزی حکومت کی وہ بزدلی تھی جو ان کی شورش پسند طبیعت سے حکومت پر ظاہر ہوتی تھی۔ مگر قیدِ فرنگ نے اس حریتِ کامل کے جذبہ کو کبھی سرد نہیں ہونے دیا۔ ۱۵۱

اچھا ہے اہلِ جور کیے جائیں سختیاں — پھیلے گی یوں ہی شورشِ حبِ وطن تمام
سمجھے ہیں اہلِ شرق کو شاید قریبِ مرگ — مغرب کے یوں ہیں جمع یہ زاغ وزغن تمام ۱۵۲

مولانا حسرت موہانی کی ایک غزل جو رسالہ ''الہلال'' کلکتہ میں چھپی۔ اس میں بھی انھوں نے یورپی قوتوں کے فریب کو نمایاں طور پر بیان کیا ہے۔ اسلام سے ان کی شیفتگی ہر قسم کے شک وشبہے سے بالا تھی۔ مسلمانوں کی تباہی و بربادی اور عالم اسلام پر دشمنوں کی غارت گری اور تاراجی پر انھوں نے ہمیشہ اپنی آواز بلند کی ہے۔ ۱۵۳ اس غزل میں بھی یورپ کی باطنی طبیعت کو مزید نمایاں کیا ہے:

ابھی تم کو سمجھے نہیں اہلِ مغرب — بتادو انھیں گرمِ پیکار ہوکر
فریب و دغا کے مقابل میں تم بھی — نکل آؤ بے رحم و خوں خوار ہوکر
یہ ترک و عرب ٹھان لیں اپنے دل میں — رہیں گے نہ محروم کفار ہوکر
وہ ہم کو سمجھتے ہیں احمق جو حسرت — وفا کے ہیں طالب دل آزار ہو کر ۱۵۴

۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کا نتیجہ ترکوں کی توقعات کے خلاف سامنے آیا تو اس وقت انور پاشا ۱۹۲۱ء میں بخارا پہنچے۔ مقصد یہ تھا کہ وسط ایشیا کے ترکوں کو روسیوں کی غلامی سے نجات دلا کر ایک اسلامی مملکت کی بنیاد رکھی جائے۔ یہ وہی انور پاشا ہیں جنھوں نے ترکی فوج کے سپہ سالار ناظم پاشا کو گولی سے اڑا دیا تھا۔ مولانا حسرت موہانی نے کان پور کی مسجد کے فیصلے سے متاثر ہوکر یہ شعر کہے ۱۵۵:

گو بظاہر شیر ہوں باطن میں بودے دل کے ہیں — مظہر الحق نام ہے پیرو مگر باطل کے ہیں
مظہر و انصارِ مظہر نے یہ ثابت کر دیا — ہم میں اب بھی کچھ نمونے ناظم وکامل کے ہیں
کیوں نہ ہو خطرے میں حسرت قافلہ احرار کا — راہ زن ہوں جب وہی جو راہ برمنزل کے ہیں ۱۵۶

انور پاشا اتحاد اسلامی کے زبردست حامی تھے اور مذہب اسلام کے فدائی بھی۔ مصطفیٰ کمال، لینن اور اسٹالن کی لامذہبیت کی وجہ سے ان کے سخت مخالف تھے۔ جب وہ وسط ایشیا میں جنگ کر رہے تھے تو اس وقت ہندوستانی مسلمانوں کی نظریں انور پاشا پر لگی ہوئی تھیں اور خیال تھا کہ انور پاشا فاتحانہ حیثیت سے ہندوستان میں داخل ہوں گے۔ مولانا حسرت موہانی نے بھی یہ شعر کہے جو

جذبات وعقیدت سے مملو ہیں ۱۵۷:

میں کس خوشی سے دل و دیدہ فرشِ راہ کروں — اگر وہ ترک ادھر بھی کہیں گزار کرے
خدا سے اب یہ دعا ہے کہ جلد بادِ مراد — کہیں تلافیِ مافاتِ روزگار کرے ۱۵۸

اسی غزل میں ایک قطعے میں حسرت نے پیغام یوں پہنچایا ہے:

ہے ایک پیام ہمارا بھی اسے نسیمِ دکن — خدا تجھے طرف افروز و غم شکار کرے
ملے جو اس سے تو کہنا کہ ترے شوق کا راز — کہاں تلک دلِ حسرت نہ آشکار کرے ۱۵۸

مولانا ظفر علی خان: (۱۸۷۳ء۔۱۹۵۶ء)

مولانا ظفر علی خان کا شمار بیسویں صدی کی ناقابل فراموش شخصیات میں ہوتا ہے جن کی نثر نگاری اور شاعری نے ہندوستانی مسلم معاشرے پر گہرے اثرات مرتسم کیے ہیں۔ انھوں نے اپنی سیاسی جدوجہد اور ادبی کارناموں کے ذریعے ہندوستانی مسلمانوں میں حریت و انقلاب کی روح پھونکی اور ادبی دنیا میں ایسے معیارات قائم کیے جو سیاسی حالات کو بدلنے میں بھی معاون ہوئے۔

ظفر علی خان، جمال الدین افغانی کی پر اثر شخصیت سے بھی متاثر تھے اور انھوں نے اتحاد اسلامی کے تصور کو اپنی عملی جدوجہد میں کبھی فراموش نہیں کیا، ان کا مقصد صرف اتنا تھا کہ مسلمان ممالک بے دار ہوں، متحد ہوں اور اپنی عزت و وقار کا تحفظ کریں۔ ۱۶۰

ظفر علی خان کی شاعری نے عوامی اذہان پر اچھے اثرات مرتب کیے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے روزمرہ سیاسی حالات پر جدوجہد کرنے کے لیے لوگوں کو ابھارا۔ اس لحاظ سے وہ عوامی شاعری میں اپنا مقام دیگر شعرا سے بلند رکھتے ہیں۔ ۱۶۱

ظفر علی خان کے زورِ قلم سے اس دور کی رودادِ سیاست تاریخی اہمیت کی حامل بن گئی، طرابلس اور بلقان کی جنگ سے متاثر ہو کر مولانا ظفر علی خان نے جو کچھ لکھا۔ اس میں ان کے جذبہ ایمانی کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ یورپ کی استعماری قوتوں نے اسلامی ممالک کے ساتھ جو سلوک کیا اس کا ایک ایک نقشہ ظفر علی خان کی شاعری میں دیکھا جا سکتا ہے ۱۶۲۔ اپنی ایک نظم نئی صلیبی جنگ میں یورپ کے سامراجی ذہن کو یوں نمایاں کرتے ہیں:

مسیحیوں اور مسلموں میں یہ جنگ جس وقت سے ٹھنی ہے — بدن کو دیتی ہے روح دھمکی کہ آ گیا وقت جاں کنی ہے
سمجھ رہے ہیں یہ اہلِ یورپ کہ ہم مسلماں کو لوٹ لیں گے — جہاں میں چھا جائے گا اندھیرا یہی جو یورپ کی روشنی ہے ۱۶۳

اٹلی نے جب طرابلس پر حملہ کر دیا تو فرانسیسی وزیر خارجہ نے کہا تھا کہ ''طرابلس اب خانہ زنبور بن گیا ہے اور اٹلی نے ایسی حالت پیدا کر دی جس کا نتیجہ اس کے لیے اور خود ہمارے لیے برا ہے۔'' ۱۶۴ ہندوستانی مسلمان اور ظفر علی خان ان حالات سے بے حد متاثر تھے۔ ظفر علی خان نے جنگ طرابلس کے حوالے سے کئی نظمیں لکھی تھیں جن میں ''ترک اور اطالوی''، ''کارزار طرابلس''، ''جنگ

طرابلس''، ''بادل میں بھی سمندر'' مشہور ہیں۔ان میں ''کارزار طرابلس'' ایک ایسی نظم ہے جس میں تاریخ اور حالات حاضرہ کو مدغم کے ظفر علی خان نے رجزیہ انداز پیدا کر دیا ہے۔اس نظم میں روما کی چیرہ دستیوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔۱۶۵

اس نظم میں پاپائیت پر بھی طنز کیا گیا ہے جو عیسائی مذہب کی ترویج واشاعت کے لیے کوشاں رہا جو خود کو انسانیت کا پیغامبر ظاہر کرتے ہیں مگر ان کے حواریین جن میں اٹلی کے لشکر بھی شامل ہیں وہ مسلمانوں پر طرابلس میں کیا کر رہے ہیں۔ وہ اس نظم میں برطانوی سامراج سے سوال کرتے ہیں کہ تم اس ستم کو کیوں نہیں روکتے۔مگر اس سوال کے ساتھ اس عزم کا اعادہ بھی کیا گیا ہے خواہ مسلمان کتنے ہی کمزور کیوں نہ ہوں مگر محمدؐ کے نام پر سر کٹانے کو اپنے لیے فخر وانبساط سمجھتے ہیں اور یہی جذبہ ان کی شکست کو کامیابی سے ہم کنار کر دے گا۔۱۶۷ :

چمک اے تیغ روما کا نشان ہے تو مٹانے کو — گرج اے توپ اٹلی کے دھوئیں ہے تو اڑانے کو
مسلمان لاکھ بودے ہوں مگر نام محمدؐ پر — خوشی سے اب بھی حاضر ہیں وہ اپنے سر کٹانے کو
یہ چوتھے آسماں پر جا کے عیسیٰؑ سے کوئی کہہ دے — کہ نکلی آپ کی امت ہے قصرِ امن ڈھانے کو ۱۶۸

اسی طرح ''جنگ طرابلس'' میں انھوں نے اٹلی کی بزدلی اور ترکوں کی بہادری کو اپنے اشعار کا موضوع بنایا ہے۔ان کا اس نظم میں کہنا ہے کہ پاپائے روم جن ارمانوں کو سجائے ہوئے طرابلس پر حملہ آور ہوئے تھے مسلمانوں کی جفاکشی اور بہادری نے ان کی ساری امنگوں کو خاک میں ملا دیا:

کھیل بچوں کا جسے سمجھا تھا اٹلی نے، وہ جنگ — کر رہی ہے قافیہ اس کے جواں مردوں کا تنگ
خاک بن کر اڑ گئی روما کے دل کی آرزو — خون ہو کر بہ گئی پاپا کے پہلو کی امنگ
اینٹ وکٹر کی گری پتھر محمدؐ کا چلا — قول سعدی ہے کلوخ انداز را پاداش سنگ
پھونک دی اٹلی نے چشمِ روشنِ ایماں میں خاک — چڑھ گیا آئینۂ انصاف پر یورپ میں زنگ ۱۶۹

ظفر علی خان نے مسلمانوں کو اپنی شاعری میں قرآن کے حوالے دے کر یہ باور کرایا ہے کہ اگر مسلمان اپنی حالت کو بدلنے پر تیار نہیں ہوں گے تو پھر ان کی حالت کوئی نہیں بدلے گا۔اسی لیے ظفر علی خان نے اپنی شاعری میں مسلمانوں کو مسلمان بنانے کی تگ ودو کی۔ویسے بھی ان کا اصل میدان رزم ہی ہے اور وہ تنہا اس میدان میں مبارز طلبی کے لیے نظر آتے ہیں۔۱۷۰:

تجھے تہذیبِ مغرب سبز باغ اپنا دکھاتی ہے — یہ ساماں ہو رہا ہے تری نیت کے پھسلنے کا
رسول اللہؐ خود گرتے ہوؤں کو تھام لیتے ہیں — تجھے اے بے خبر ہر وقت موقع ہے سنبھلنے کا

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی　　نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا ۱۷۱

مولانا محمد علی نے طبی وفد کی تشکیل میں جو کام کیا اس میں ہندوستان کے تقریباً تمام بڑے قومی رہ نماؤں نے حصہ لیا۔ ظفر علی خان نے اس موقعے پر مسلمانانِ ہند کے سیاسی زاویہ نگاہ کو اس طرح بیان کیا ہے:

تجھ سے اے ترکی ہمارا برقرار اعزاز ہے　　تو ہمارے واسطے سرمایۂ صد ناز ہے
گونجتی تھی محفلِ عالم کبھی جس ساز سے　　تو اسی سازِ بلند آہنگ کی آواز ہے
آئی ہے اٹلی کی شامت موت ہے سر پر سوار　　اس لیے کھولے ہوئے اپنا دہانِ آز ہے ۱۷۲

ظفر علی خان نے انجمن ہلال احمر کے لیے چندہ جمع کرنا شروع کیا اور ترکی کے وزیر اعظم کی خدمت میں وہ روپیہ پیش کرنے کے لیے روانہ ہو گئے۔ جب ظفر علی خان نے ترکی کا دورہ کیا تو وہاں شملجہ کے محاذ کا بھی دورہ کیا جہاں غازی انور پاشا کی معیت میں اس حصے کا معائنہ کیا تھا جو اٹلی سے برسر پیکار تھا۔ ۱۷۳ جب سلطان عبدالحمید سے ان کی ملاقات ہوئی تو انھوں نے ایک فارسی قصیدہ بھی ان کے لیے لکھا۔ ۱۷۴

قسطنطنیہ سے واپسی کے بعد مصر میں وہاں کے علما سے ملاقاتیں کیں جن میں سید رشید رضا کا نام قابل ذکر ہے اسی دوران یہ اطلاع ملی کہ حمیدیہ جہاز کے شہرۂ آفاق کپتان غازی رؤف پاشا اسکندریہ میں موجود ہیں۔ آپ نے غازی رؤف پاشا کو خط لکھا اور ملاقات کی آرزو کا اظہار کیا۔ رؤف پاشا نے نہ صرف ملاقات کی بلکہ وہ توپ بھی دکھائی جس کے ذریعے حمیدیہ جہاز اطالوی فوجوں پر گولہ باری کر کے واپس آ رہا تھا۔ ظفر علی خان نے انتہائی جوش میں اس توپ کو بوسہ دیا۔ ۱۷۵

ظفر علی خان کی ان سرگرمیوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ عالمِ اسلام میں اتحادِ باہم کو ضروری خیال کرتے تھے۔ اس لیے انھوں نے مشہدِ مقدس پر روسی گولہ باری پر سر ایڈورڈ گرے (Edward Grey) جو برطانیہ کے خارجہ امور سے تعلق رکھتے تھے گلا کیا ہے۔ یہی وہ تاریخی نظم ہے جس کے لکھنے پر زمیندار اخبار عمر بھر مصائب و نوائب کی تمہید بن گیا ۱۷۶:

ہوا جس کی ثنا میں تر زباں اس طرح قا آنی　　وہ تھا اپنے زمانے میں بلا شک شانِ یزدانی
ابھی تک یادگار ان کی ہے باقی مشہدِ سر میں　　مسلمانوں کو پہنچے اس سے جو فیضانِ روحانی
سر ایڈورڈ! آج آتش زیر پا سارے مسلماں ہیں　　پریشاں کیوں نہیں کرتی تمھیں ان کی پریشانی
لگایا روس نے پہلوئے مسلم میں وہاں چرکا　　یہاں لائی ہے رنگ اس زخم کی خوں نابہ افشانی ۱۷۷

اتحاد اسلامی کے حوالے سے مولانا ظفر علی خان نے ہندوستان کے مسلمانوں کے نقطۂ نظر کو واضح کرتے ہوئے مارچ ۱۹۲۰ء کو برہان پور میں خلافت کے حوالے سے تقریر میں کہا ہے کہ:

''ہم آئینی طور پر جدوجہد کرتے رہیں گے اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک حکومت برطانیہ تنگ آکر خلافت اسلامیہ کے متعلق نامبارک کوششوں سے خود دست کش نہ ہوجائے۔ یہ وقت خاموشی کا نہیں بلکہ افلاک میں غلغلہ ڈالنے کا ہے خواہ اس غلغلہ افگنی کے لیے صورِ اسرافیل سے صور ہی کیوں نہ مستعار لینا پڑے۔''۱۷۸

''حالی کی چند ابیات کی تخمیس'' کے عنوان سے، نوآبادیات نے جس طرح مسلمان کے ممالک کے ٹکڑے کیے اس کی صورت حال پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

مشرق میں ٹھیکہ ایک نے تبریز کا لیا　　مغرب میں دوسرے نے مراقش کو کھا لیا
جو ہم نے گم کیا تھا وہ یورپ نے پالیا　　یارانِ تیز گام نے محفل کو جالیا
ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے۱۷۹

مولانا ظفر علی خان کی شاعری میں تاریخی واقعات اس طرح وقوع پذیر ہوئے ہیں جن سے جدید حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ان کی نظموں میں ستیزہ کاری اور میدان کارزار کا نقشہ ہمہ وقت اس لیے موجود ہے کہ خود ان میں بھی جذبہ ایثار پایا جاتا ہے۔ عہد حاضر کی ان برگزیدہ ہستیوں سے انھیں خاص عقیدت تھی جو اسلام کے ستونوں کو مضبوط کرنے کے لیے کوشاں تھیں۔انھوں نے اپنی نظموں میں ایک ایسا منظر نامہ ترتیب دیا تھا جن میں اکابر اسلام کا ذکر موجود ہے۔مولانا نے شاعری میں امت مسلمہ کے درد کو اپنا درد سمجھ کر پیش کیا ہے اور وہ مخالف طاقتوں کو پھیلتے ہوئے برداشت نہیں کر سکتے۔۱۸۰ اسی لیے بلقانیوں کو نہایت موثر انداز میں طنز کا نشانہ بنایا ہے:

بلقانیوں کا شور ہے کوؤں کی کائیں کائیں　　خبریں ہیں ان کی فتح کی سب آئیں بائیں شائیں
ہوتا ہے کوئی دم میں جلال حق کا آشکار　　یہ کشتگانِ غمزۂ ابلیس رہ تو جائیں
ڈالا زمیں میں ظلم سے یورپ نے زلزلہ　　مسلم دعا سے پایۂ عرشِ بریں ہلائیں ۱۸۱

ترکوں کو عالم اسلام میں مرکزیت حاصل تھی۔اسی لیے عالم اسلام کے مسلمان یہ چاہتے تھے کہ وہ یورپ کی ریشہ دوانیوں سے بچ جائیں تاکہ مسلمانوں کو دوبارہ عروج حاصل ہو۔یہی وجہ ہے کہ طرابلس اور بلقان کی جنگ میں اخوت اسلامی کا جذبہ پوری دنیا میں بالعموم اور ہندوستانی مسلمانوں میں بالخصوص موجود تھا۔ظفر علی خان نے اپنی آپ بیتی ''ازالۃ الخفا'' میں لکھا ہے کہ:

''ترکوں کی نوزائیدہ طاقت کو فنا کرنے کے لیے دولِ مغرب نے بلقان میں ایک اور شرارہ چھوڑ دیا تو پھر بھی کوئی ایسی جماعت اس ملک میں موجود نہ تھی جو اسلام کے ان سرفروشوں کی مدد کے لیے فراہمیِ سرمایہ کا کام اپنے ہاتھ میں لے۔ظفر علی خان کا یہ بھی کہنا ہے کہ 'زمیندار' اخبار نے اس کام کا بیڑا اٹھایا۔''۱۸۲

خیر یہاں پر ظفر علی خان خود پسندی کا شکار ہوگئے ہیں مگر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ انھوں نے جس تن دہی سے چندہ

مہم کا آغاز پنجاب میں کیا اس کی مثال دو چار اصحاب کو چھوڑ کر کسی اور کے یہاں نہیں ملتی۔ اس اخبار کے توسط سے پانچ لاکھ کی خطیر رقم مولانا نے ترکی کو فراہم کی اور پھر ''کامریڈ اخبار'' نے بھی اس میں اپنا کردار ادا کیا۔ یہ اقدامات بھی اخوت اسلامی کی سمت میں ایک زندۂ جاوید مثال ہے۔۱۸۳؎ جسے ہر مشکل وقت میں عالم اسلام کے مسلمانوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔

ظفر علی خان بنیادی طور پان اسلامسٹ تھے۔ انھوں نے اس حوالے سے لکھا کہ ''پان اسلامزم مسلمانوں میں ازل سے موجود ہے ان کا سفرِ یورپ بھی اس لیے تھا کہ وہ ترکی میں ان مجاہدین کی حوصلہ افزائی کریں جو بلقان کی وادیوں میں برسرِ پیکار ہیں۔ وہ انھیں اس بات کا احساس دلانا چاہتے تھے کہ ہندوستان کے سات کروڑ دور افتادہ بے کسوں کی دعائیں تمھارے ساتھ ہیں۔۱۸۴؎ اسی لیے انھوں نے نہایت خاموشی سے یہ سفر کیا اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوسکی۔ اس سفر کے دوران ظفر علی خان نے ایک نظم ''سمندر کی روانی اور تخیل کی جولانی'' لکھی۔ اس میں مسلمانوں پر یورپی جارحیت کے خلاف درد وغم اور آہ وبکا کی کیفیات موجود ہیں:

مسلمِ بے چارہ کے حق میں اسی کے فیض سے — صرف رجعت ہو رہی ہے گردشِ لیل و نہار
ساحل اٹلی کا ادھر سسلی کے مینارے ادھر — وہ فضا سے ہم کلام اور وہ صبا سے ہم کلام
مسلم بے کس کے خوں میں پرورش پائے ہوئے — اس کی دل کش گھاٹیاں اس کے دل آرا مرغزار
آہ وہ سسلی بسایا تھا جسے ہم نے کبھی — اندلس کی طرح مغرب میں ہماری یادگار
پرچمِ توحید اڑا تھا جس کے ساحل پر کبھی — اور اذانوں سے کبھی گونجے تھے جس کے کوہسار ۱۸۵؎

ان کی شاعری میں اسلامی اقدار و روایات کی ہمہ گیر صورت اس طور سے سامنے آئی ہے کہ اس دور کے سیاسی واقعات سے متعلق ہونے کے باوجود شعر و ادب کی دنیا میں آج بھی زندہ ہیں۔ ان کے لکھے ہوئے پُر تاثیر اشعار خواہ کسی بھی واقعے سے اثر انداز ہوئے ہوں، ان میں فکر و احساس کی جھلک ضرور نمایاں ہے جو اردو شاعری میں بیش قیمت اضافے کے طور پر کبھی فراموش نہیں کی جاسکتی۔

علامہ اقبال: (۱۸۷۷ء۔۱۹۳۸ء)

اقبال قومیت اور وطنیت کے مغربی تصور کو مسلمانوں کے لیے خطرہ سمجھتے تھے۔ وہ اتحاد اسلامی کے خواہاں تھے ان کی نظم و نثر میں مسلمانوں کو ایک مرکز پر متحد ہو کر سیاسی جدوجہد کرنے کی خواہش کا اظہار عام طور پر ملتا ہے۔ ڈاکٹر نکلسن (Dr Nicolson) کو ۲۴ جنوری ۱۹۱۲ء کے خط میں لکھتے ہیں کہ:

> ''دراصل اسلام بلکہ کائنات انسانیت کا سب سے بڑا دشمن رنگ و نسل کا عقیدہ ہے اور جو لوگ نوع انسانی سے محبت کرتے ہیں ان کا فرض ہے کہ ابلیس کی اس اختراع کے خلاف علم جہاد بلند کریں۔''۱۸۶؎

اقبال نے اپنے فکر وفن کے ذریعے ملت اسلامیہ کا تصور پیش کیا بلکہ ان میں خود شناسی اور خود آگاہی کا ولولہ بھی پیدا کیا ہے۔ اقبال کی غایت یہی تھی کہ ساری دنیا کے مسلمان توحید باری اور رسول اللہ کی محبت سے سرشار ہو کر اخوت اسلامی کا مظاہرہ کریں۔۱۸۷ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں بھرپور طریقے سے اتحاد اسلامی کا جذبہ ایک تحریک کی میں صورت دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے ''جاوید نامہ'' میں جمال الدین افغانی اور سعید حلیم پاشا کی معیت میں نماز کے ادا کرنے کو جنت کے حصول کے لیے درست مزدوری قرار دیا ہے۔۱۸۸ اس نظم میں اقبال، افغانی سے کہتے ہیں کہ:

> میں اس دنیا کے موجودہ حالات سناؤں جہاں سے میں آیا ہوں۔ مجھے دکھ کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ مسلمان اپنے حقیقی ورثے کو بھول کر مغربی تصورات کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ وہ عالم گیر ملت اسلامیہ کی ایک وحدت کے بجائے اپنی قومی شناخت سے وفاداریاں نبھا رہے ہیں۱۸۹

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور — ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور — تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے — جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے ۱۹۰

اقبال کا یہ بھی کہنا ہے کہ وطنیت کا مغربی تصور ایسا ہے جس سے پوری دنیا رشک، حسد میں مبتلا ہو جائے گی اور کمزور پس کر رہ جائیں گے۔ اس سے ایسی معیشت اور معاشرت تشکیل پائے گی جس میں دوسرے کو حق دینے کا جذبہ مٹ جائے گا:

اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے — تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے — کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے — قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے ۱۹۱

اقبال نے ملت اسلامیہ کو ایسے نظام کا پابند رہنے کی تلقین کی جس میں مکر کی چالیں نہ ہوں۔ انھوں نے یہ کہا کہ مغربی تہذیب نے گرمیِ بازار اور تجارت کے نئے نئے طریقوں کے ذریعے بنی آدم کے دل سے حق کی روشنی چرالی ہے موجودہ عہد میں مذہب کی بالادستی محض خواب ہے۔۱۹۲ اس کے لیے ضروری ہے کہ زائرانِ حریم مغرب کی رہبری کو ترک کر کے نئے سرے سے ملت اسلامیہ کو تشکیل دیں:

کل ایک شوریدہ خواب گاہ نبی میں رو رو کے کہہ رہا تھا — کہ مصر و ہندوستان کے مسلم بنائے ملت مٹا رہے ہیں
یہ زائرانِ حریم مغرب ہزار رہبر بنیں ہمارے — ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا جو تجھ سے ناآشنا رہے ہیں ۱۹۳

اقبال کے پیغام کا مرکز ومحور یہ ہے کہ مسلمان ہر طرح کے قومی اور نسلی تعصبات سے کنارہ کش ہو کر ایک واحد، منظم اور مستحکم

ملتِ اسلامیہ کا جزو بن جائیں، دین کو وطن پر ترجیح دیں۔[۱۹۴] انھوں نے رنگ وقومیت سے اجتناب کی تلقین کی ہے۔ یہی اسلام کی بنیادی تعلیم بھی ہے۔ ان کی کئی ایسی نظمیں ہیں جس میں مسلمانوں کو مرکزیت قائم کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کی قومی زندگی اسلام کے بغیر ادھوری ہے۔ انھوں نے مثال دے کر کہا کہ جو نسبت انگلستان کو انگریزوں اور جرمنوں کو جرمنی سے ہے وہ اسلام کو ہم مسلمانوں سے ہے۔ ہمارا اصول یہ ہے کہ خدا کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہیں ورنہ ہمارا شیرازہ بکھر جائے گا۔[۱۹۵]

اقبال نے اسی تصور کے تحت ۱۹۱۱ء کے انجمن اسلام کے جلسے میں اپنی نظم ''شکوہ'' پیش کی۔[۱۹۶] اس نظم کا پس منظر بھی اتحاد بین المسلمین کے جذبے کو فروغ دینے پر مشتمل دکھائی دیتا ہے۔ ۱۹۱۱ء کے اوائل ہی میں سلطنت عثمانیہ کے کئی علاقے برطانوی اور یورپی سامراج کے قبضے میں چلے گئے تھے۔ ایران پر عملاً روسی، برطانوی اور کسی حد تک جرمنی اثرات کی حکمرانی تھی۔ ۱۹۱۱ء میں ہی تقسیم بنگال کی تنسیخ نے ہندوستانی مسلمانوں کو مزید صدمے میں مبتلا کر دیا تھا، اسی لیے علامہ اقبال نے خدا کے حضور مسلمانوں کی جانب سے شکوہ کیا ہے۔ اس بند میں انھوں نے سلطنت عثمانیہ کے اس دور کی نشاندہی کی ہے جب مسلمانوں کی سلطنت یونان، البانیہ، بلغاریہ، ہنگری اور آسٹریا تک پھیلی ہوئی تھی۔[۱۹۷] اپنی اس نظم میں کہتے ہیں کہ:

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں — خشکیوں میں کبھی لڑتے کبھی دریاؤں میں
دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں — کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں
شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہاں داروں کی — کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی[۱۹۸]

اقبال نے ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی مقاصد کو بھی ملی انداز سے ہی دیکھا ہے۔ تقسیم بنگال کی تنسیخ کے بارے میں انھوں نے ۱۴ دسمبر ۱۹۱۱ء کو عطیہ بیگم فیضی کے نام خط میں لکھا ہے کہ:

> ''ہندوؤں نے بنگال کی دو حصوں (ہندو بنگال اور مسلم بنگال) میں تقسیم کو حکومت کی طرف سے بنگالی قومیت کے قلب پر ایک کاری ضرب سے تعبیر کیا ہے لیکن حکومت کی طرف سے دہلی کو دارلسلطنت قرار دے کر اپنے فیصلے کی خود ہی پوری ہوشیاری سے تنسیخ بھی کر دی ہے۔ بنگالی سمجھتا ہے جیت اس کی رہی لیکن اسے نظر نہیں آتا کہ اس کی اہمیت گھٹا کر صفر کر دی گئی ہے۔ اس سلسلے کے متعلق دو شعر ہو گئے ہیں۔''[۱۹۹]

مندمل زخمِ دلِ بنگال آخر ہو گیا — وہ جو تھی پہلے تمیزِ کافر و مومن گئی
تاج شاہی آج کلکتے سے دہلی آ گیا — مل گئی بابو کو جوتی اور پگڑی چھن گئی[۲۰۰]

اقبال کی پوری شاعری حق و باطل کے معرکے سے لبریز ہے انھوں نے مسلمانوں کے اتحاد کو تمام چیزوں پر فوقیت دی ہے۔ اسی لیے تقسیمِ تنسیخ بنگال اور یورپی جارحیت کو انھوں نے ملت اسلامیہ پر جاری یلغار کے تناظر سے دیکھا ہے۔ جب شمالی ایران پر روس

نے مظالم ڈھائے تو انھوں نے اپنی نظم جواب شکوہ میں مسلمانوں کو یوں مخاطب کیا ہے:

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے — نشۂ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے
ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے — پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے
کشتیِ حق کا زمانے میں سہارا تو ہے — عصرِ نو رات ہے دھندلا سا ستارا تو ہے ۲۰۱

اس زمانے کے اہم واقعات کی بازگشت اقبال کی نظموں میں سنائی دیتی ہے۔۲۰۲ جنگِ طرابلس کے موقعے پر اقبال کی نظم ''فاطمہ بنت عبداللہ'' بھی اس جنگ کے حوالے سے لکھی گئی اور تمام نظموں میں انفرادیت کی حامل ہے:

فاطمہ تو آبروئے امتِ مرحوم ہے — ذرہ ذرہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے
یہ سعادت، حورِ صحرائی تری قسمت میں تھی — غازیانِ دیں کی سقائی تری قسمت میں تھی
یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی — ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی ۲۰۳

اپنی ایک نظم ''حضور رسالت مآب میں'' انھوں نے دعائیہ انداز میں مسلمانوں کی زبوں حالی کو دور کرنے کے لیے حضور سرور کائناتؐ کے سامنے عجز کا اظہار کیا ہے۔ یہ نظم اقبال نے ۱۹۱۲ء میں شاہی مسجد لاہور کے اس جلسے میں سنائی تھی۔ جو ظفر علی خان نے جنگِ بلقان کے سلسلے میں ترکوں کی مالی امداد کے لیے منعقد کیا تھا۔۲۰۴

اس نظم میں اقبال نے حضور سے کہا ہے کہ ہم مسلمان اس دنیا میں اگر آسودگی تلاش کریں تو وہ ہمیں کہیں نہیں ملتی۔ لاکھوں کی تعداد میں اسلام کو ماننے والے موجود ہیں مگر تیرے ﷺ نام پر قربان ہونے والوں کی تعداد بالکل نہیں۔ مگر میرے پاس ایک ایسا جام ہے جس میں تیری ﷺ امت کی آبرو اور طرابلس کے شہیدوں کا لہو شامل ہے۔ آپ ﷺ اسے قبول کریں تاکہ اس دہر میں ہم مسلمانوں کو آسودگی مل سکے۔۲۰۵

حضور دہر میں آسودگی نہیں ملتی — تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاضِ ہستی میں — وفا کی جس میں ہو بو وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں — جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں — طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں ۲۰۶

اقبال کی نظم ''شمع و شاعر'' بھی اتحادِ اسلامی کے قوی رجحان کا پتا دیتی ہے۔ اس نظم میں جہاں خودی کا نظریہ ملتا ہے وہیں مسلمانوں کو عظمتِ رفتہ کی یاد دلا کر ان کے دلوں میں جدوجہد کے عمل کو تیز کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔۲۰۷ اقبال کو عمر بھر یہ احساس ستاتا

رہا کہ وہ اپنی ملت کے لیے کچھ نہیں کر سکے۔ سید نذیر نیازی کا بیان ہے اقبال کہا کرتے تھے: ''میں نے اسلام کے لیے کیا کیا؟ میری خدمت اسلامی تو بس اتنی ہے جیسے کوئی شخص فرطِ محبت میں سوئے ہوئے بچے کو بوسہ دے۔''۲۰۸

اس پوری نظم میں اقبال نے ملت اسلامیہ کو جرأتِ رندانہ پر آمادہ کرنے کی اور نیند کی گراں باری سے جھنجھوڑ کر جادۂ عمل پر گام زن ہونے کی ترغیب دی ہے۔۲۰۹

رو رہی ہے آج اک ٹوٹی ہو ئی مینا اسے — کل تلک گردش میں جس ساقی کے پیمانے رہے
آج ہیں خاموش وہ دشتِ جنوں پرور جہاں — رقص میں لیلیٰ رہی لیلیٰ کے دیوانے رہے
وائے ناکامی! متاعِ کارواں جاتا رہا — کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا ۲۱۰

اقبال نے اپنی ایک نظم ''محاصرہ ادرنہ'' میں ترکوں کی سیرت کا ایک روشن پہلو دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ اس واقعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ترکوں کے دل میں شریعت کی پاس داری کس قدر تھی۔ ایڈریانوپل جسے ترکی میں ادرنہ کہتے ہیں، فروری ۱۹۱۳ء میں ترکوں کے ہاتھ سے نکل گیا تھا لیکن غازی انور پاشا نے جولائی ۱۹۱۳ء میں اسے دوبارہ فتح کر لیا تھا۔۲۱۱

غازی انور پاشا نے مجبور ہو کر شہر کے باشندوں کے سامان پر قبضہ کر لیا لیکن فقیہہِ شہر نے فتویٰ دیا کہ ذمی کا مال مسلمانوں کے لشکر کے لیے حرام ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فوج نے بھوک کی تکلیف برداشت کی لیکن عوام کے مال کو واپس کر دیا۔۲۱۲

نظم ''بلادِ اسلامیہ'' میں بھی ترکوں کے دارالخلافے قسطنطنیہ کی تعریف کرتے ہوئے اسے ملت اسلامیہ کا دل قرار دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ:

خطۂ قسطنطنیہ یعنی قیصر کا دیار — مہدی امت کی سطوت کا نشان پائدار
صورتِ خاکِ حرم یہ سرزمیں بھی پاک ہے — آستانِ مسند آرائے شہِ لولاک ہے
نکہتِ گل کی طرح پاکیزہ ہے اس کی ہوا — تربتِ ایوب انصاری سے آتی ہے صدا
اے مسلماں! ملتِ اسلام کا دل ہے یہ شہر — سیکڑوں صدیوں کی کشت وخوں کا حاصل ہے یہ شہر ۲۱۳

اقبال کی کئی اور نظمیں بھی ہیں جس میں اتحاد اسلامی کے رجحانات پائے جاتے ہیں۔ ''خضر راہ''، ''طلوع اسلام'' جیسی نظموں میں دنیائے اسلام اور اس میں انتشار و اضمحلال کو تصویر کی صورت دکھایا ہے۔ اقبال کا کہنا ہے کہ: ''مغربی استعماریت کی پوری عمارت معاشی استیصال اور سیاسی توسیع کے نظریات کی بنیاد پر قائم ہے۔''۲۱۴ ''ترکی میں خلافت کے تصور کو پامال کر دیا گیا ہے۔ اگر مسلمان دوبارہ عزت وجاہ وجلال چاہتے ہیں تو انھیں اتحاد بین المسلمین کے بھولے ہوئے سبق کو دوبارہ زندہ کرنا ہوگا۔''۲۱۵

ز۔خ۔ش (زاہدہ خاتون شیروانیہ) (۱۸۹۴ء۔۱۹۲۲ء):

ز۔خ۔ش (زاہدہ خاتون شیروانیہ) بھی اتحاد اسلامی کی تحریک سے متاثر تھیں۔ان کی دور اوّل کی نظموں اور غزلوں میں مسلمانوں کو انگریزوں کی چیرہ دستیوں سے نکلنے کی جدوجہد کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ان کی ایک نظم ''ظہور امام'' میں موجودہ حالات کو بنیاد بنا کر کہا گیا ہے کہ امام مہدی کے آنے کا وقت آچکا ہے، دنیا اب اس شخصیت کی منتظر ہے۔وہ ظالم حاکم جنھوں نے ظلم کے پہاڑ توڑے ہیں، ان سے تیری سیادت میں ہی انتقام لیا جائے گا۔چوں کہ ترکی اس دنیا میں مسلمانوں کی سیادت کر رہا ہے اس لیے اس کی فوجیں امام مہدی کی رہبری میں قدم آگے بڑھائیں گی۔یہ نظم مخمس کی ہیئت میں ہے۔وہ کہتی ہیں کہ:

قائدِ فوج شہِ ترکی و ایراں ہوں گے　　اٹلی و روس یہ سب تابعِ فرماں ہوں گے
طبیبِ خاطر سے کل انگریز مسلماں ہوں گے　　جارج سلطان ترے نائبِ سلطاں ہوں گے
تیری تصدیق کرے گا شہ جاپاں آجا

ضعف اسلام ترقی پہ ہے شاہا! دن رات　　ہے یہ تجویزِ اطبائے فلاطوں اوقات
یک دلی ، یک جہتی کا یہ پیے آبِ حیات　　آپ ہیں خضرِ زماں آپ ہیں شمعِ ظلمات
آہ دردِ دلِ اسلام کے درماں آجا[۲۱۶]

ز۔خ۔ش کی نظموں میں روحانی عنصر بہت کم اور سیاسی شعور بہت زیادہ تھا۔وہ ایسے موضوعات پر قلم اٹھاتی تھیں، جنھیں اس وقت کسی شاعرہ سے نسبت دینا لوگوں کے تخیل سے بعید تھا۔ان کی نظموں میں سیاسی شعور اور وسعت عملی کی ایک شان تھی۔جس نے ان کی شاعری کو مردانہ وجاہت بخش دی تھی[۲۱۷]۔انھوں نے اپنی شاعری میں جس غیرتِ ملی کا ثبوت دیا اس کی مثال کسی اور خاتون شاعر میں ملنا مشکل ہے۔

انھوں نے اپنی نظموں میں عظمت ماضی کے نقوش کو دوبارہ زندہ کیا ہے اور شعوری کوشش یہ کی ہے کہ ان نظموں کے ذریعے لوگوں میں مذہب سے دلی وابستگی اور قومی غیرت زندہ کی جائے۔ان کا کہنا یہ تھا کہ اسلام ہی اصل طاقت ہے جو ہمارے دلوں کو آپس میں جوڑ سکتی ہے۔اتحاد بین المسلمین کا درس انھوں نے یوں دیا ہے:

کس لیے ہم سے تنفر ہے تجھے؟ استقلال　　یک دلی! کیوں نظر آتی نہیں صورت تیری
مذہبی جوش! پھر اک بار دکھا دے جلوہ　　دردِ اسلام! پھر اٹھ آ کہ ہے حاجت تیری[۲۱۸]

جنگ طرابلس کے حوالے سے ایک نظم میں مسلمانوں کی سلطنت پر غیروں کا تسلط ہو جانے پر یوں شکوہ کیا ہے:

ارضِ اسلام پر غیروں کی حکومت کیسی　　قبل از وقت یہ آئی ہے قیامت کیسی

نورِ انصاف ہوا دہر سے یک دم کافور　　چار سو پھیل گئی ظلم کی ظلمت کیسی
اٹلی غیر مہذب ہمیں تہذیب سکھائے　　راہِ گم کردہ سے امیدِ ہدایت کیسی ۲۱۹

نظم ''بصائرِ سیاسیہ'' میں بھی انھوں نے برطانیہ کے کردار کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے کہا ہے کہ:

ہم ہیں سرکار پہ قربان وہ ہم سے بدظن　　ہائے قسمت سے ملی ہے ہمیں قسمت کیسی
جارج پنجم شہ برطانیۂ عظمیٰ کی　　کیا بتائیں کہ دلوں میں ہے محبت کیسی ۲۲۰

اپنی مثنوی ''عالمِ خواب'' میں طرابلس میں جاری جنگ کو پیش کیا ہے اس کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ رزمیہ مثنوی بے حد رواں اور پُر جوش ہے۔ اس میں انھوں نے پردہ دار خواتین کی عزت لٹ جانے پر افسوس کا اظہار کیا ہے:

بپا تھا سر بہ فلک کیمپ اٹلی والوں کا　　تمام شہر پہ قبضہ تھا بد خصالوں کا
یہ بحر روم پہ لاشوں کا پل بنائیں ابھی　　زمینِ خشک میں دریائے خوں بہائیں ابھی
اسی گروہ میں تھیں پردہ دار خاتونیں　　فدائے ملت و غیرت شعار خاتونیں ۲۲۱

یہ مثنوی طویل ہے اور اس میں غم و غصے کا بھی اظہار کیا گیا ہے۔ ایک مقام پر انھوں نے اطالویوں کے کردار کی بھرپور مذمت کی ہے۔

اطالوی بھی عدوئے شہِ بشر نکلے　　خدا کی شان ہے لو چیونٹی کے پر نکلے
خبیث! اسمِ شہِ پاک اور تیرا منہ　　صحابۂ شہِ لولاک اور تیرا منہ ۲۲۲

ز۔خ۔ش نے انجمن ہلال احمر میں چندہ دینے کے لیے ہندوستانی مسلمان خواتین کو بھی ابھارا۔ اس نظم کا نام انھوں نے ''اپیل'' رکھا۔ اس نظم میں جہاں مسلمانوں کو اس بات کی تلقین کی گئی ہے کہ وہ اپنے بھائیوں کی امداد و اعانت کریں وہاں انھیں اس نظم میں باخبر بھی کیا گیا ہے کہ ترکوں کی بہادری اور جاں فشانی کو دیکھ کر یورپی قوتوں نے بلقانی ریاستوں کو اس پر چڑھ جانے کی در پردہ طور پر سازش کی ہے۔

جب دشمنوں نے دیکھا یہ جاں گسل تماشا　　ہوتے نہیں ہیں زچ یہ آفندی اور یہ پاشا
بلقان کو ابھارا یہ کہہ کے بے تحاشا　　یورپ سے آج نکلے دین عرب کا لاشا
اس طرح سے چھڑی ہے یہ کارزار بہنو
بلقانیوں نے اکثر قصبے جلا دیے ہیں　　پھانسی پہ امن پرور شہری چڑھا دیے ہیں
اسباب سب کے لوٹے گھر سب کے ڈھا دیے ہیں　　اربابِ گنج و زر کو فاقے کرا دیے ہیں
باور نہ ہو تو پڑھ لو ریوٹر کے تار بہنو ۲۲۳

اس نظم میں زبان و بیان کی روانی اپنی جگہ مگر جوش و جذبے کی فراوانی متاثر کن ہے۔ برصغیر کی خواتین جو روایتاً خاموش تماشائی تھیں انھیں بے دار کرنے کے لیے ایسی نظم نے متاثر کن کردار ادا کیا۔۲۲۴ مخمس کے انداز میں لکھی گئی یہ نظم اس وقت کے حالات کا نقشہ کھینچتی ہے جن سے ترک گزر رہے تھے اس نظم میں تاریخی حقائق کے علاوہ ہندوستان میں انگریز حکومت کے منافقانہ کردار کو بھی عمدگی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ طرابلس کی خواتین کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ:

پھرتی ہیں ماری ماری عزت شعار بہنیں — وہ پاک باز بہنیں وہ پردہ دار بہنیں
ہیں وارثوں کے غم میں خوں نابہ بار بہنیں — اللہ سے اجل کی ہیں خواست گار بہنیں
فانی ہے عیشِ دارِ ناپائے دار بہنو

ترکانِ پاک دیں کے دیکھے جو یہ مصائب — بھائی ہوئے ہمارے بے غیرتی سے تائب
پایا خوشامدی کو اس حلقہ سے جو غائب — حاتم بنا خدیوِ ہندوستان کا نائب
ہیں اک ادب پہ فائق یہ اک ہزار بہنو۲۲۵

مولانا شبلی ہی کے انداز میں انھوں نے نظم ''شہر آشوب اسلام'' لکھی اس نظم میں بھی ممالک اسلامیہ پر چھائی ہوئی زوال کی کیفیت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس نظم کا ایک پورا حصہ ترکوں کے عادات و خصائل کا عکاس ہے:

نہ پوچھ ہم نفسو! بار بار کیا ہیں ترک — وجودِ حسنِ خلائق کا مدعا ہیں ترک
خروشِ فتح کی ہیں گونج زیرِ گنبدِ چرخ — جیوشِ جاہ و حشم کے نشانِ پا ہیں ترک
نہیں ہے بحرِ عمیقِ جہاں میں ہولِ فنا — جہازِ ملت بیضا کے ناخدا ہیں ترک
یہ قول شبلی علامہ حرفِ قسمت ہے — زوالِ دولتِ عثماں زوالِ ملت ہے ۲۲۶

انھوں نے ایک نظم انور پاشا پر لکھی ہے جس میں ان کی بہادری اور جفاکشی کو سراہا گیا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ:

کیسی دل سوزی سے کہتی شمعِ گریاں تجھ سے ہے — اے مرے انور ضیائے بزم امکاں تجھ سے ہے ۲۲۷

انور پاشا چوں کہ انجمنِ اتحادِ نو جوانانِ ترک کے سرگرم رکن تھے اور ہندوستانی مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ یہ سمجھتا تھا کہ اس انجمن نے جو دستوری انقلاب برپا کیا ہے اس سے ترکی دوبارہ عظمت و شوکت حاصل کر لے گا، مگر ایسا ہوا نہیں۔ جنگ بلقان کی ناکامی نے اس انقلاب کو بھی ناکامی سے دوچار کر دیا۔ بہر حال اس نظم میں انور پاشا کی شخصیت کو انھوں نے عظیم انقلابی کے طور پر پیش کیا ہے۔

یا ہو تاجِ فتح سر پر ورنہ تن پر سر نہ ہو — دیکھ او غازی ابھی تک میان میں خنجر نہ ہو

صلح جُو ہوں تجھ سے گر بلقانیِ پیماں شکن　　پائیں خنجر کی زباں سے پاسخِ دنداں شکن
تیری صورت کل مسلماں قوم کے شیدا ہوں کاش　　عالمِ اسلام میں انور کئی پیدا ہوں کاش ۲۲۸

ہندوستانی مسلمان ابھی ان معاملات کو دیکھ کر رنجیدہ تھے کہ مسجد کان پور کا واقعہ پیش آیا۔اس واقعے نے ہندوستانی مسلمانوں پر یہ عیاں کر دیا کہ انگریزی حکومت سے کسی بھی قسم کی اچھی توقع رکھنا خام خیالی ہے۔ز۔خ۔ش نے بھی اس سے متاثر ہو کر نظمیں کہیں:

پھٹ گیا محکوم و حاکم کا لباس اتحاد　　انفراق اے ہم نشیں چولی سے دامن نے کیا ۲۲۹

جنگ عظیم اوّل کے حوالے سے انھوں نے اپنی نظم ''جنگ فرنگ'' میں اپنی سیاسی بصیرت کا ثبوت دیا ہے اور عالمی سیاسی حالات پر اظہار خیال کیا ہے:

جوزف فرانسس کی حکومت کو کر دیا　　اندھا جنونِ ولولۂ انتقام نے
اسٹیم رولر اور نشان اجل بڑھے　　جنگی ترانا گایا فرنچ اژدہام نے ۲۳۰

ابراہیم بیگ چغتائی:

ابراہیم بیگ چغتائی نے ''جنگ یونان وروم'' کے عنوان سے ایک مثنوی ۱۸۹۷ء میں لکھی۔اس مثنوی کے ابتداء میں شاعر کا کہنا ہے کہ ''میں نے اس جنگ کے واقعات کو جناب قاضی محمد جلال الدین مراد آبادی کی ''تاریخ یونان وروم'' اور دیگر تاریخ کی کتابوں سے اخذ کر کے منظوم کیا ہے۔''۲۳۱

ان کا خیال تھا کہ اس لڑائی میں ترکوں نے جو کامیابی حاصل کی ہے اس کی گونج عالم اسلام میں تادیر قائم رہے گی۔لہذا انھوں نے یہی مناسب سمجھا کہ اس پورے واقعے کو مثنوی کی صورت میں بیان کیا جائے۔۲۳۲

ابراہیم بیگ چغتائی کو اس منظوم تاریخ لکھنے کے عوض جو رقم کتابوں کی فروخت کی صورت میں حاصل ہونا تھی اسے حجاز ریلوے کے لیے وقف کر دیا تھا۔موصوف انجمن اسلام گوالیار کے سیکریٹری تھے۔۲۳۳ مثنوی میں ترکی فوج کے بارے میں یوں اظہار خیال کرتے ہیں۔

دور جو فوج کے ڈویژن تھے　　دوسرے دن وہ فوج میں ملتے
ایک نے پائی جنگ کی جو خبر　　ہوگیا جنگ میں شریک آکر
مار کر تیس کوس کا دھاوا　　شام ہونے سے پہلے آپہنچا ۲۳۴

اس مثنوی میں جابہ جا ترکوں کی تعریف اور جنگی واقعات کو منظوم کیا گیا ہے۔ کس طرح یونانیوں نے ترکوں سے جنگ کی، کون سے سیاسی عوامل تھے۔ کہاں کہاں ان کو ہزیمت اٹھانی پڑی اور کن کن مقامات پر ترکوں نے اپنی بہادری کا سکہ منوایا۔ ترکی افواج نے دولو کے مقام پر جب حقی پاشا کے ہم راہ پیش قدمی کی تو اس کا نقشہ مثنوی میں یوں بیان کیا گیا ہے:

فوج ترکی کے دو بڑے دستے — حقی پاشا کے ماتحت جو بڑھے
ایک نے لے لیا ویلسٹینو — دوسرا آیا جانب دولو
راہ میں ایک سخت جنگ ہوئی — زک سپاہِ گریس نے کھائی ۲۳۵

جب ترکوں نے دولو کو فتح کر لیا تو اس وقت ترکی افواج نے وہاں کے شہریوں کے ساتھ کیا سلوک کیا' ان حالات کو اس مثنوی میں کچھ یوں بیان کیا ہے:

فتح ویلسٹینو دولو کا — حقی پاشا کے سر رہا سہرا
مجتمع شہر کے ہیں باشندے — باادب اپنے سر کیے ننگے
سچے دیں دار اور شجاعوں کا — خلق مشہور سب جہاں میں رہا
جانتے سب ہیں کہ یہ عثمانی — ظلم کرتے نہیں کسی پہ کبھی ۲۳۶

جب نجیب پاشا نے حقی پاشا کے کہنے پر تقریر کی اور وہاں کے تمام باشندوں کو امان بخشی تو تاریخی حقیقت کو اس مثنوی یوں پیش کیا گیا ہے:

یہ کہا پھر نجیب پاشا نے — میر عسکر ہیں تم سے فرماتے
ہے یہ اعلان ان کی جانب سے — تم میں ہر شخص کان دے کے سنے
تم کو دی جاتی ہے اماں کامل — اور آزادی تم کو ہے حاصل
اپنے ناموس و جان و مال تمام — سمجھیں محفوظ تم میں خاص و عام ۲۳۷

یہ مثنوی اردو رزمیہ شاعری میں ایک انوکھی مثال پیش کرتی ہے۔ شاعر نے جنگ کے جدید طریقے کو شاعری کا لباس پہنا کر بالکل ایک نئے طرز کی ابتدا کی ہے۔ یونانی مورچوں پر ترکوں کے حملے جس انداز میں ہوئے، اس کی پیش کش کا انداز بھی وہی ہے:

بولتے مورچوں پہ ہیں دھاوا — جس پہ غرہ تھا دشمنوں کو بڑا
جنگ کی لہر میں جو ترکی تھے — بحر مواج کی طرح وہ بڑھے

مورچوں کی طرف یہ فوج بڑھی　　جس طرح موج ہو سمندر کی
نغمۂ جنگ ان کا ہوش ربا　　جنگ کے بینڈ سے بھی دل دہلا ۲۳۸

اس مثنوی کے آخر میں سلطان عبدالحمید کی مدح میں ایک قصیدہ بھی لکھا گیا ہے۔ جس میں ان سے بے حد عقیدت کا اظہار ہوتا ہے جو اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ ترکی خلیفہ سے عقیدت رکھنا ہندوستانی مسلمانوں میں عام رویہ تھا۔ صرف عوام ہی نہیں بلکہ خواص بھی ترکی کے خلیفہ سلطان عبدالحمید سے انسیت رکھتے تھے۔ ایک مقام پر انھوں نے اپنی مثنوی میں لکھا ہے کہ:

ترک کیسے ہی ہوں شکستہ حال　　ساتھ ان کے ہے جنگ امر محال
روس پر منکشف ہوا پیہم　　رکھ سکے گا نہ جنگ وہ قائم ۲۳۹

حجاز ریلوے پر انھوں نے ایک شذرہ بھی لکھا ہے جس میں اس ریلوے کو مقدس ریلوے کہا گیا ہے۔ اس کے استحکام کے لیے ایک دعائیہ نظم بھی موجود ہے۔ جس کا ایک شعر یہ ہے:

ذریعۂ خیر و سعادت ہے حجازی ریلوے　　مومنوں پہ حق کی رحمت ہے حجازی ریلوے ۲۴۰

اس مثنوی کے ضمن میں شیخ نورالدین کی مثنوی ''قصۂ شاہ روم'' کا ذکر کرنا از حد ضروری ہے۔ انھوں نے اس میں سلطنت عثمانیہ کے سیاسی اور عمرانی حالات وواقعات بیان کیے ہیں اسے بیان کرنے کا ایک مقصد یہ بھی ان کے پیش نظر رہا کہ مسلمانوں کا چاہے شاہ ہو یا گدا اگر وہ دین سے غافل ہوتا ہے تو تباہی اس کا مقدر ہو جاتی ہے۔ مثنوی میں مسلمانوں کو اس بات کی تنبیہہ بھی کی گئی ہے کہ وہ ان ممالک سے سبق سیکھیں جو کبھی تاج وتخت کے مالک تھے مگر آج غیروں کے ہاتھوں ذلت ورسوائی اٹھا رہے ہیں۔ مثنوی کا آغاز یوں ہوتا ہے:

خودی کے کام سے بندو ڈرو تم　　یہ شاہ روم کا قصہ سنو تم
عجب اس شاہ کا یہ تذکرہ ہے　　خودی سے اپنی کیا کیا دکھ سہا ہے
اسے سن کر جو ہووے مرد عاقل　　خدا کے خوف سے ہووے نہ غافل ۲۴۱

چوں کہ قصہ صرف ترکی شاہ کا ہے جو دین سے غافل ہے مگر شاہ روم کے تعلق سے قصہ لکھا گیا ہے اس لیے اسے بھی پیش کرنا میں نے مناسب سمجھا۔

آغا غلام حسین ارشد:

آغا غلام حسین ارشد کی نظمیں رسالہ ''تمدن'' دہلی میں ملتی ہیں ان کے حالات کا علم نہیں ہو سکا، مگر ان کی نظموں کا ذخیرہ دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس زمانے میں اتحاد اسلامی کا جذبہ پیدا کرنے والے اہم لوگوں میں شمار کیے جاتے ہوں گے۔

رسالہ ''تمدن'' اپریل ۱۹۱۳ء میں ان کی ایک نظم ''نالہ جگر سوز'' چھپی، اس نظم کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ:

''ہلال احمر کے شفاخانے سے یہ نالہ جگر سوز بلند ہو کر جب سے میرے کان تک پہنچا ہے تب سے میرے دل کی حالت تو ناگفتہ بہ ہے لیکن نہیں معلوم کہ اس کے سننے سے مسلمانان ہند کے قلب کی کیا کیفیت ہوگی۔ جس مظلومہ کے حال نے مجھے اس نظم کے کہنے پر مجبور کیا اس کی نہایت مختصر سی روداد 'اک دردناک نظارہ' کے عنوان سے روزنامہ 'زمیندار' ۱۵ر مارچ ۱۹۱۲ء کو چھپ چکی ہے۔ میں اپنی اس ستم رسیدہ بہن کی طرف سے جملہ اہل اسلام کی خدمت میں متذکرہ بالا نظم پیش کرتے ہوئے استدعا کرتا ہوں کہ وہ اس غریب کے لیے جو ہلال احمر کے شفاخانہ میں زیر علاج تھی اور طرابلس کے دوسرے زخمی بھائی بہنوں کی امداد کے لیے جس قدر چندہ ممکن ہو سکے فراہم کریں۔'' ۲۴۲

اس نظم میں انھوں نے مسلمانوں کی غیرت وحمیت کو جھنجھوڑا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مسلمانوں کو اب اپنے دین وملت کا پاس رکھتے ہوئے اپنی حمیت اور آئینِ وفاداری کے بھولے ہوئے سبق پر عمل کرنا ہوگا۔ خوابِ غفلت سے بیدار ہو کر شریعت کے بتائے ہوئے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے دوبارہ ملت اسلامیہ کے احیا کی جدوجہد کرنی ہوگی۔ انھوں نے اس نظم میں اطالویوں کے ظلم وستم کی بھی منظر کشی کی ہے۔ مسلمانوں کی جمعیت کی پریشانی کا نقشہ نہایت دردناک انداز میں بیان کیا ہے۔ ایک بند میں کہتے ہیں کہ:

مسلمانو! تمھیں کچھ پاس بھی ہے دینِ ملت کا — خیال آتا بھی ہے تم کو کبھی اپنی حمیت کا
کیا ہے آج کل کیوں ترک آئینِ وفاداری — سبق دینا نہیں اسلام کا تم کو اخوت کا
زمانہ جاگتا ہے اور تم ہو خواب غفلت میں — نہیں ہے کچھ تمھیں احساس ہی اپنی مصیبت کا ۲۴۳

ہندی مسلمانوں کو اس جنگ میں مالی امداد پر آمادہ کرنے کے لیے جذباتی لہجے میں اکساتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

ہمیں کیا حق نہیں حاصل ہے مسلم کی کمائی میں — دوا کے ہی لیے کچھ بھیج دو اپنے خزانے سے
نہ کی جب وقت پر امداد پھر کس کام آؤ گے — کفن بنواؤ گے جب ہم گذر جائیں زمانے سے
تمھارے دل میں گر اسلام کی کچھ بھی محبت ہو — مسلماں ہو! مسلمانو! شریکِ رنج وراحت ہو ۲۴۴

آغا غلام حسین ارشد نے یورپ کے جارحانہ رویے پر ایک نظم ''تازہ ستم'' کے نام سے لکھی۔ اس نظم میں انھوں نے یورپی پالیسیوں پر نکتہ چینی کی ہے اور مسلمانوں کی درخشاں روایات کو بیان کرتے ہوئے دوبارہ اس مؤقف کی تائید کی ہے کہ ہمیں اخوت کا سہارا لے کر دنیا میں اپنے وقار کی بحالی کے لیے جدوجہد کرنی پڑے گی۔ وہ کہتے ہیں کہ:

مشہور تھے جہاں میں ہم آن بان والے — جھکتے تھے آستاں پر عرش آستان والے
زیرِ نگیں تھے سارے نام و نشان والے — دب کر رہے ہمیشہ تاب و توان والے
رفعت نشاں رہا ہے ہر جا علم ہمارا — خورشیدِ تمکنت تھا دستِ کرم ہمارا ۲۴۵

پھر اسی نظم میں مسلمانوں پر تباہی و بربادی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

کوئی ہمیں بتا دے دنیا میں بن کے عادل — کیا ہم ہی رہ گئے تھے ایسی جفا کے قابل
اس وقت وہ نہیں ہیں روزِ جزا کے قائل — جا کر کہاں چھپیں گے ہنگامِ حشر قاتل
چہرہ ہے سرخ خوں سے خورشیدِ خاوری کا — نزدیک آگیا ہے دوراں داوری کا ۲۴۶

ان کی شاعری میں پان اسلامزم کے جذبات کے علاوہ ملت اسلامیہ کے زوال کی نمایاں تصویریں جو حادثات اور سانحات سے عبارت ہیں نمایاں ہو کر سامنے آتی ہیں۔ مگر انھوں نے امید کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے۔ اس پُر الم ماحول میں بھی انھوں نے مسلمانوں کو مجتمع کر کے زمانے کے ساتھ چلنے کا درس دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

ہو کے بیدار انقلابِ چرخ کج رفتار دیکھ — چال چلتا ہے زمانہ کیسی یہ رفتار دیکھ
سمتِ مغرب سے طلوعِ شمس کے آثار دیکھ — دیکھ مشرق کا ذرا اجڑا ہوا گل زار دیکھ
ہم صفیرانِ چمن کی غور سے گفتار سن — نالۂ قمری، فغانِ عندلیب زار سن ۲۴۷

آغا غلام حسین ارشد چوں کہ اضطراری کیفیت میں شاعری کر رہے تھے۔ اس لیے ان کی نظمیں ایک خاص نظریہ اور فکر سے مربوط دکھائی دیتی ہیں۔ جہاں تک ان کی شاعری کا تعلق ہے اگر وہ اس پر خصوصی توجہ دیتے تو ان میں ایک اچھے شاعر کے جوہر پنپ سکتے تھے۔ ان تمام باتوں سے قطع نظر ان کی شاعری میں اقبالؔ کے گہرے اثرات ملتے ہیں:

انقلابِ دہر سے ہے شورشِ محشر بپا — شمع کے شعلے نے پروانے کو خاکستر کیا
تیرِ جلادِ فلک نے ہاتھ میں خنجر لیا — دم بہ دم ارشد یہی آتی ہے ہاتف کی صدا
ہے تیری ہستی کا دنیا سے سفر ہشیار ہو — سر پہ آپہنچی قیامت بے خبر ہشیار ہو ۲۴۸

تحریکِ اتحادِ اسلامی کے مطالعے کے دوران یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ اردو نظم و نثر دونوں میں اس تحریک اور ان واقعات کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے جو ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء کے درمیان وقوع پذیر ہوئے۔ شعرا نے کثرت کے ساتھ ان جنگی معرکوں پر نظمیں لکھیں جن سے اس وقت مسلم ممالک دوچار تھے، ان واقعات کی منظر کشی، اصل صورت حال کا ادراک، سیاسی چال بازیوں سے

پردہ اٹھانے کا عمل، بیداری اور شعور کے لیے جدوجہد اس دور کے موضوعات رہے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان حالات کا بھی جائزہ نظموں اور دیگر نثری کتابوں میں پیش کیا گیا کہ مسلمان آخر ان حالات سے دوچار کیوں ہوئے۔ کیا مسلمانوں میں فہم وفراست کی کمی تھی جس نے ان کو اس مقام پر لا کھڑا کیا۔ ۲۴۹

ان نظموں میں خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کے تابندہ ماضی کو موضوع بناتے ہوئے موجودہ صورتِ حال سے موازنہ کیا جاتا رہا ہے تاکہ مستقبل کے امکانات میں مسلمان اپنے ماضی کو کسی صورت فراموش نہ کریں۔

آغا غلام حسین ارشد نے اسی سوچ وفکر کے ساتھ اپنی ایک نظم ''مکالمۂ رند وشیخ'' میں ملت کے مسائل کو مکالماتی انداز میں نمایاں کیا ہے۔ انھوں نے واضح طور پر مسلمانوں سے کہا ہے کہ اب زمانہ نہایت تیزی سے کروٹ بدل رہا ہے اس بدلتی ہوئی صورتِ حال میں اگر ہم نے اپنے حالات کو تبدیل نہیں کیا تو دنیا میں دوسری قوموں کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ چوں کہ مغرب سے راست مقابلہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ علم وہنر سے لیس ہو کر فنی، حربی اور تحقیقی میدان میں انھیں شکست سے دوچار کیا جائے۔ اس نظم میں ایک جگہ انھوں نے خوش خلقی کے بارے میں یوں کہا ہے کہ:

مہرباں بہلا کے من کو کیوں نہ ہو دل کو قلق — کر دیا سینے کو سنگِ بد زبانی سے جو شق
یوں تو حضرت کو بہت کچھ دعویٰ اسلام ہے — بیٹھ کر کعبہ میں سیکھا کافروں کا سا سبق
دور ہے یہ امر تو اسلام کی تہذیب سے — خلق سکھلاتا ہے ہر انسان کو قانونِ حق ۲۵۰

آغا غلام حسین ارشد کی نظم ''اسلام'' ایک طویل نظم ہے جس میں مسلمانوں کے ماضی، حال اور مستقبل کے نقوش واضح طور پر موجود ہیں۔ انھوں نے اس نظم میں حرمتِ اسلام اور شوکتِ اسلام کو ماضی کے پردے میں دیکھا ہے۔ حال میں نبی اکرمؐ سے دعا مانگی ہے کہ اس دین کا پاس رکھنے والے صلیبی طاقتوں کے نشانے پر ہیں اگر آپ نے مسلمانوں پر کرم نہیں کیا تو اس دین کا نام ونشاں بہت تیزی سے مٹ جائے گا۔ اس نظم میں مستقبل کی صورت گری کرتے ہوئے انھوں نے کہا ہے کہ مسلمانوں کو علم وہنر سے آراستہ ہو کر دوبارہ اسلام کی سربلندی کے لیے ایک میدان میں جمع ہونا ہوگا۔ انھوں نے کہا ہے ایک دور وہ بھی تھا جب کہ اسلام کا سکہ زمانے بھر میں چلتا تھا مگر اب ان کی ساری حکومتیں اغیار کے قبضے میں چلی جا رہی ہے:

تھی ایک زمانے میں مشہور طاقتِ اسلام — ہر ایک ملک تھا زیرِ حکومتِ اسلام
یہ اوج پر تھا ستارہ بلند بختی کا — کہ پہنچی عرشِ معلیٰ پہ شوکتِ اسلام
مگر زمانے کی گردش نے کھو دیا سب کچھ — کہاں ہے زور کدھر ہے وہ دولتِ اسلام

کہوں میں کیا کہ کوئی حد نہیں غریبی کی　　یہ مفلسی تو علامت ہے بد نصیبی کی ۲۵۱

اس نظم میں شاعر نے یورپی طاقتوں کے جارحانہ رویوں کو دیکھتے ہوئے اللہ کے حضور شکوہ کیا ہے اس میں ان کا کہنا ہے کہ اسلام اور اس کی قوت غیر مسلموں کو کسی صورت گوارا نہیں ہے۔ اگر آپ نے نظرِ کرم نہ کی تو مسلمانوں کی قوت جلد از جلد تباہ و برباد ہو جائے گی:

تجھے بھی کیا نہیں یارب نبی کی دین کا پاس　　ہماری خواری و زاری کا کچھ تو کر احساس
سنائیں حالِ دلِ بے قرار ہم کس کو　　ہمیں تو تیرے سوا اور نہیں کسی کی آس
مٹانا گر تجھے منظور ہے جہاں سے ہمیں　　دے گھول کے ہمیں پانی میں زہرۂ الماس
نشانِ دینِ ہدیٰ مٹ کے خاک ہو جائے　　عدو ہوں خوش جو یہ قصہ ہی پاک ہو جائے ۲۵۲

آگے چل کر انھوں نے اللہ سے کہا ہے کہ یارب ارشد نے جو باتیں کی ہیں کیا وہ بجا نہیں ہیں۔ لہذا مسلمانوں کے حال پر رحم کر اور انھیں دین و دنیا کی دولت سے سرفراز کر کے دوبارہ وہی مقام عطا کر جو ان کا طرۂ امتیاز تھا:

یہ کہہ رہا تھا کہ ہاتف نے دی ندا ارشد　　کہی جو تو نے ابھی بات تھی بجا ارشد
سن اس کو ہوش سے کہتا ہے یہ خدا ارشد　　میں سن رہا ہوں ترا نالۂ رسا ارشد
نہ میرے عرش کو فریاد سے ہلا ارشد　　قبول ہے، کرے اس وقت جو دعا، ارشد
پسند آیا نہایت ہمیں سخن تیرا　　کہے تو لعل و گہر سے بھریں دہن تیرا ۲۵۳

آغا غلام حسین ارشد نے ''ساقی نامہ'' میں اپنے دل پہ چھائی ہوئی غم واندوہ کی کیفیت کو پر اثر انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ زوال امت کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ میرے مقدر میں تہی دست ہونا ہی لکھا تھا۔ مسلمانوں میں انحطاط کے موضوع پر ان کا دردناک بیان اس ساقی نامہ میں دیکھا جاسکتا ہے۔ ان کی نظموں میں جس انداز میں مسلمانوں کی حالت زار کی کیفیت بیا کی گئی اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے الفاظ کے ذریعے قلب اور روح کو تڑپا دینا چاہتے ہیں۔

ساقی نامے کی روایت کے مطابق، اس میں شاعر نے ساقی کو مخاطب کر کے مسلمانوں میں ایمان و یقین کو جلا بخشی ہے ان کے دل میں جو ملی درد و احساس موجود ہے وہ ایسی کش مکش کا نتیجہ ہے جس سے عالم اسلام اس وقت دوچار تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ:

تجھ کو کیوں کر یہ گوارا ہے کہ مضطر ہو کر　　پھینک دوں چیر کے پہلو سے امانت تیری
آبرو دین نبی کی جو ہے منظور تجھے　　کس لیے جوش میں آتی نہیں غیرت تیری

گردش ساغرِ صہبائے حجازی دکھلا　　بھیج اب ساقی کو اور بندہ نوازی دکھلا ۲۵۴

شاعر کی ان نظموں سے یہ اضطراب نمایاں ہے کہ وہ ملتِ اسلامیہ کو متحد دیکھنا چاہتا ہے۔ ان کی سوچ وفکر کا بنیادی اور مرکزی نقطہ یہی رہا کہ ہم اس دورِ غلامی سے کسی صورت نکل جائیں۔ دوبارہ اپنے قدموں پر کھڑے ہوکر دنیا میں شریعتِ محمدی کو نافذ کر دیں تاکہ نوعِ انسانی یورپ کی انسانیت سوز منصوبوں سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا پالے۔

ہر طرف چلنے لگے پھر مئے توحید کا جام　　صفتِ مہر بلندی پہ ہو اسلام کا نام
نکل آ جلد مدینے سے خدارا ساقی　　ہاتھ میں جام ہو شانے پہ نشانِ اسلام
دل ہو مسرور مرا سن کے حجازی نغمہ　　رنج وغم میں ہوئی جاتی ہے میری عمر تمام
یارسول عربی وقتِ مدد ہے اب تو　　شاد امت ہو تیری اور ہوں دشمن ناکام
پھر دلِ امتِ مرحوم کو زندہ کردے　　پھر سے ہشیار ہوں دنیا میں ترے مئے آشام ۲۵۵

آغا غلام حسین ارشد کی نظموں کے علاوہ ان کی غزلوں میں بھی ملی احساس نمایاں ہے۔ ان کی ایک غزل جولائی ۱۹۱۴ء کے ''تمدن''، دہلی میں فارسی زبان میں شائع ہوئی۔ اس غزل کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے دل جمعی کے ساتھ شاعری کی ہے۔ وہ اپنے زمانے میں ایک شاعر کی حیثیت سے بھی جانے جاتے تھے مگر افسوس ان کا مجموعہ کلام موجود نہیں ہے جس سے ان کی شاعری کا تفصیلی مطالعہ ممکن ہوسکتا۔ ان رسائل میں جو کچھ بھی موجود ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کے سیاسی اور ملی تناظر کو اپنی شاعری میں خصوصی جگہ دی تھی۔

شاہ قسیم الدین:

شاہ قسیم الدین کا مجموعۂ کلام ''دردِ جگر'' جو مطبع اخبار الپنچ بانکی پور سے شائع ہوا تھا اس میں جتنی نظمیں بھی شامل ہیں ان پر پان اسلامزم کا احساس غالب ہے۔ شاعر نے قومی جوش وجذبے کے تحت یہ نظمیں ان جلسوں میں پڑھیں جو جنگ طرابلس اور جنگ بلقان کے مجروحین کے فنڈ کے لیے منعقد کیے جاتے تھے۔

ان نظموں میں یورپ کی ستم رسانی اور ان کی پالیسیوں پر تنقید بھی ہے اور مسلمانوں کی غیرتِ دینی کو زندہ کرنے کی کوشش بھی دکھائی دیتی ہے۔ ان نظموں کے بارے میں ان کے دوست نے یہ رائے دی ہے کہ:

> ''میں تمھارے قومی جوش وجذبے کی داد دیتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ اپنی نظموں کو شائع کر کے قوم کو ممنون کروگے ۔ میں جانتا ہوں کہ تمھاری جھجک تمھاری ناتجربہ کاری کی وجہ سے ہے۔'' ۲۵۶

ان نظموں کو دیکھنے سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں نے کوئی ایسا شہر اور قصبہ نہیں چھوڑا جس میں ترکوں سے محبت اور عالم اسلام کے مسلمانوں کی ترجمانی نہ کی گئی ہو۔ بانکی پور کی جامع مسجد میں ۲۶ مئی ۱۹۱۳ء کو جو اجلاس ہوا اس میں قسیم الدین صاحب نے یہ نظم پڑھی جس میں ترکوں کی بہادری اور انور بے کی جرأت کو بھی سلام پیش کیا گیا تھا:

تظلّم کی لگی ہیں اپنے دل میں برچھیاں لاکھوں — ستم گارو سمجھ رکھو مزا اس کا چکھا دیں گے
رہے سایہ فگن انور اگر چندے جو ترکی میں — تو کل ہم صوفیہ میں فتح کے جھنڈے اڑا دیں گے ۲۵۷

ایک نظم ترک مجروحین کی امداد کے لیے ۲۳ فروری ۱۹۱۳ء میں بانکی پور ہی میں پڑھی جس میں مولانا ابوالکلام آزاد بھی شریک تھے اس نظم میں بھی انھوں نے یورپ کو طنز کا نشانہ بنایا ہے اور مسلمانوں سے کہا ہے کہ وہ اپنے آباء کی جرأت کو دوبارہ زندہ کر دیں تاکہ بلقان کو شکست سے دوچار کیا جائے:

خدا سب کو بچائے مکر سے ابلیسِ یورپ کی — یہ وہ فتنے ہیں جو ہشیار کو غافل بناتے ہیں
کہیں گے کچھ کریں گے کچھ یہی گُر ہے حکومت کا — اسی کو ڈپلومیسی اپنی وہ حضرت بتاتے ہیں
ستم گارانِ یورپ ہوش میں آئیں سنبھل جائیں — انھیں اب جرأتِ آبائی کے جوہر دکھاتے ہیں ۲۵۸

انیسویں صدی کے ابتدائی عشرے میں شاعری ہی نہیں بلکہ زندگی کے دیگر شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد بھی عالمی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں سے خاصے متاثر تھے۔ اسی لیے مسلمان شعراء کے یہاں ہمیں خصوصی طور پر یہ دکھائی دیتا ہے کہ انھوں نے ترکی اور دیگر ملکوں کے مسلمانوں کے حالات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ یہ خیالات تقریباً ایک جیسے ہی تھے بس لفظوں کے فرق اور جذبوں کی حدت میں تبدیلی دکھائی دیتی ہے۔

کسی بھی شاعری کو اگر مخصوص واقعاتی پس منظر میں دیکھا جائے تو پھر اس کا دائرہ اثر محدود ہوتا جاتا ہے قسیم الدین صاحب کی شاعری بھی اسی کا مظہر ہے انھوں نے پان اسلامزم کے تصور کے تحت جو شاعری کی اس میں تنوع نہیں ہے بلکہ وہ صرف واقعاتی بیان کا نمونہ بن کر رہ گئی ہے۔

علامہ شبلی نعمانی کی نظم ''شہر آشوب اسلام'' سے متاثر ہو کر شاہ قسیم الدین نے جنگِ بلقان پر نظم لکھی۔ اس نظم میں خیالات تک شبلی سے مستعار لیے ہیں:

غبارِ کفر کی سر پر رہیں گی بدلیاں کب تک — چلیں گی ظلم و ذلت کی ہمیں پر آندھیاں کب تک
مراکش مصر و چیں، فارس گئے اپنی حکومت سے — گریں گی قہر و آفت کی خدایا بجلیاں کب تک

یہ شورِ جنگِ بلقان کا، ہماری آفت جاں ہے　　شہیدِ ظلم کے خوں سے بہیں گی ندیاں کب تک ۲۵۹

قسیم الدین صاحب کی شاعری میں قومی اور ملی احساس نمایاں ہے۔ان کی بیش تر نظموں میں معروف شعرا کے اثرات بھی پائے جاتے ہیں۔انھوں نے مسلمانوں کی مٹتی ہوئی شوکت وعظمت سے بے چین ہوکر اپنی شاعری میں ان احساسات کو پیش کیا ہے۔ بلغاریوں کے ظلم وستم کے حوالے سے ایک نظم میں کہتے ہیں کہ:

اہلِ ایماں کے نعرۂ توحید　　جن و انساں کے دل ہلائیں گے
نقشِ توحید کیا مٹائیں گے　　یہ عدو آپ منہ کی کھائیں گے ۲۶۰

بہر حال ان کی شاعری کے مجموعے میں بیشتر نظمیں جنگ طرابلس، جنگ بلقان اور ترکوں کے حوالے سے موجود ہیں اس سے ہندوستان کے ادبی ماحول پر پان اسلامزم کی تحریک کا بھرپور اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

آغا حشر کاشمیری: (۱۸۷۹ء۔۱۹۳۵ء)

مسلمانان ہند میں بلاد اسلامی کے حوالے سے جو جذبات پائے جاتے ہیں اس کا اندازہ شاعری کی صورت میں بہ خوبی لگایا جاسکتا ہے۔مسیحی قوتوں نے ترکی کو پامال کرنے کے لیے کوئی کسر باقی نہ رکھی تھی۔اقبال کی نظم ''شکوہ'' اور ''جواب شکوہ'' انھیں اسباب کا اظہار ہے۔

اسی دور میں ایک تخلیقی شاہ کار کا تذکرہ کیے بغیر بات نامکمل رہتی ہے۔یہ شاہ کار آغا حشر کاشمیری کی مشہور نظم ''شکریہ یورپ'' ہے۔حشر بنیادی طور پر ڈراما نگار تھے مگر انھوں نے اپنے ڈراموں کے ذریعے بھی یاس و ناامیدی کے ماحول میں قوم کے حوصلے میں رمق پیدا کی۔

''شکریہ یورپ'' کا لہجہ خطیبانہ شاعری کا بے مثال نمونہ ہے اس نظم کے جارحانہ انداز میں حرکت، روانی اور جوش وخروش کا تیز دھارا بہہ رہا ہے جو یاس وقنوطیت کے عام جذبات کو خس وخاشاک کی طرح اپنے بہاؤ میں بہا کر لے جارہا ہے۔اپنے حیات بخش لہجے کے اعتبار سے یہ نظم گزشتہ نصف صدی کے قومی نوحوں اور مرثیوں کے مقابلے میں ایک نمایاں حیثیت کی حامل ہے۔یہاں مشرق و مغرب آپس میں متصادم ہیں۔اسے بیان کرنے میں شاعر نے ڈرامائی انداز اختیار کیا ہے جو اس کی ہمہ گیر کامیابی کی کلید ہے۔۲۶۱

''شکریہ یورپ'' جیسی نظمیں کہنا انگریزی حکومت کے دور میں بڑی جرأت کا کام تھا۔انھوں نے اس نظم میں یورپ کے خلاف طنز کے تیر چلائے، اسی وجہ سے اس نظم کو ضبط کرلیا گیا تھا۔۲۶۲ اس نظم کے بارے میں خواجہ حسن نظامی کا کہنا ہے کہ: ''یوں تو نظم ''شکریہ یورپ'' کا ہر مصرع کوہ آتش فشاں ہے مگر آخری دعا نہایت مؤثر اور خاکستانی پیکر میں ہل چل ڈالنے والی ہے۔''۲۶۳

اس نظم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ لاہور میں انجمن حمایت اسلام کے جلسے مورخہ ۲۱ مارچ ۱۹۱۳ء میں پڑھی گئی جہاں سامعین کا انہماک قابل دید تھا۔ نظم کے آخری بند پر پہنچتے پہنچتے حشر صاحب کا گلا بھر آیا اور آواز بھاری ہوگئی حشر نے اس نظم میں انگریزی حکومت کے خلاف جو بات کہنی تھی وہ ایک دل نشین پیرائے میں کہہ دی۔ حشر کی آواز جادو بن کر قوم کے متوالوں کو حرارت پہنچاتی رہی۔ اس نظم کے بارے میں حشر کا کہنا ہے کہ: ''اس میں جو کچھ ہے وہ مسلمانانِ عالم کے اضطرابِ درونی کا اظہار ہے۔''[۲۶۴]

اس نظم میں ان کا کہنا ہے کہ مسلمانوں کا نغمۂ توحید مدتوں سے محوِ خواب تھا۔ یورپ کے حملوں نے اسے دوبارہ زندہ کر دیا۔ مسلمان جو ماضی میں تماشائی تھے اب یورپ کی پالیسیوں نے انھیں موجودہ حالات پر غور کرنے کا اور نئی راہوں کو تلاش کرنے کا حوصلہ دیا۔

مدتوں سے نغمۂ توحید محوِ خواب تھا — سازِ ہستیِ مسلماں تشنۂ مضراب تھا
پیکرِ احساس میں خوابیدہ روحِ درد تھی — شعلہ ریزیِ نواہائے اخوت سرد تھی [۲۶۵]

اس کے بعد ماضی کے روشن پہلوؤں کی جانب اشارہ کرتے ہیں جس نے مسلمانوں کو سروری اور دنیا پر حکمرانی سکھائی۔ اسلام کی تعلیمات کا اور ان اصولوں کو اس نظم میں خاص کر سراہا گیا جس کی بدولت انسانیت گمراہی اور اندھیرے سے نکل کر روشنی کی طرف آئی:

روشنی دنیا کو دی جس مہرِ عالم تاب نے — زنگِ فطرت دھو دیا جس نور کے سیلاب نے
ظلمت آگیں خلقتِ انساں کو مینا کر دیا — سنگریزے کو جلا دے کر نگینہ کر دیا
شعلے پیدا کر دیے خاکسترِ افسردہ میں — زندگی کی لہر دوڑا دی حیاتِ مردہ میں [۲۶۶]

ماضی کے اوراق کا مشاہدہ کرانے کے بعد دورِ حاضر کے مسلمانوں پر چھائی ہوئی ابتلا کی تصویر کھینچی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آج مقامِ افسوس ہے کہ وہ قومیں جنھیں ہم نے ٹھکرا دیا تھا وہی آج ہم پر حکمراں بن گئی ہیں:

تیری لب بندی سبق آموزِ گویائی ہوئی — طعنہ زن ہیں تجھ پہ قومیں تیری ٹھکرائی ہوئی
آج ان ذروں کو بھی ناز اپنی تابانی پہ ہے — تیرے در کا نقشِ سجدہ جن کی پیشانی پہ ہے
پھر بھی تنگِ زندگی آسودۂ خواری رہا — سونے والے پر وہی خوابِ گراں طاری رہا [۲۶۷]

اس نظم میں ایک حصہ یورپ کی کارستانیوں کا بھی ہے انھوں نے یورپ کے مظالم کے خلاف سخت مذمت کرتے ہوئے کہا تھا کہ صرف لفظوں کے ذریعے امن اور تہذیب کا نعرہ لگانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا، یورپ کے ستم اور اس کی تہذیب و شرافت کے دعووں کا مذاق اڑا رہا ہے:

صرف تصنیفِ ستم ہے فلسفہ دانی تری　　آدمیت سوز ہے تہذیبِ حیوانی تری
اٹھ رہا ہے شورِ غم خاکستر پامال سے　　کہہ رہا ہے ایشیا رو کے زبانِ حال سے ۲۶۸

اس نظم کے آخری حصے میں انھوں نے جو دعا مانگی ہے وہ اصل میں مسلمانوں کی زبوں حالی کا وہ احساس ہے جو ہر دردمند دل کے لب سے بے ساختہ جاری ہو جاتا ہے:

رحم کر بس اپنے آئینِ کرم کو بھول جا　　ہم تجھے بھولے ہیں لیکن تو نہ ہم کو بھول جا
خلق کے راندے ہوئے دنیا کے ٹھکرائے ہوئے　　آئے ہیں اب تیرے در پہ ہاتھ پھیلائے ہوئے
خوار ہیں بدکار ہیں ڈوبے ہوئے ذلت میں ہیں　　کچھ بھی ہیں لیکن ترے محبوب کی امت میں ہیں
حق پرستوں کی اگر کی تو نے دل جوئی نہیں　　طعنہ دیں گے بت کے مسلم کا خدا کوئی نہیں ۲۶۹

حشر کی ڈراما نگاری میں بھی شاعری کا عنصر غالب ہے۔ان کے اکثر ڈرامے شاعری سے پُر دکھائی دیتے ہیں اور مکالمے بھی بڑی حد تک منظوم ہیں ۲۷۰۔ان کی ایک اور نظم ''موج زم زم'' بھی ملت اسلامیہ کے کرب ناک حالات ک کو پیش کرتی ہے۔اس نظم کا بھی لب لباب یہی ہے کہ خدائی تائید اور مدد کے ذریعے دنیا کے بت کدے میں رحمتِ انسانیتؐ کے بھولے ہوئے پیغام کو پہنچایا جائے گا۔اس نظم کے آخر میں انھوں نے بارگاہ خدا سے دوبارہ رحمت کی طلب کی ہے:

المدد اے نعرۂ اللہ اکبر المدد　　بت کدے کو پھر بنانا ہے خدا کا گھر ہمیں
ڈگمگاتے ہیں گرے جاتے ہیں تیرے ناتواں　　اے تیری رحمت کے صدقے تھام لے بڑھ کر ہمیں
تیرے در کو چھوڑ کر ہم بے نوا جائیں کہاں　　یا بتا دے اور کوئی اپنا جیسا گھر ہمیں
دوسروں کو زور و زر سے عیش دے آرام دے　　اور ہمیں اس دولتِ دنیا سے صرف اسلام دے ۲۷۱

مولانا تمنا عمادی: (۱۸۸۸ء۔۱۹۷۲ء)

مولانا تمنا عمادی کی شاعری ان کی علمی خدمات کے سامنے دب کر رہ گئی ہے۔انھوں نے بھی مسلمانوں کے حالات اور پان اسلامزم کے جذبات کو مدنظر رکھ کر کئی نظمیں اور غزلیں کہی ہیں۔ان کی شاعری رسالہ ''تمدن'' اور ''الناظر'' کے صفحات پر بکھری ہوئی ہے ۔اتحاد اسلامی کے جذبات کے علاوہ ان کی نظموں میں ان الزامات کا جواب بھی دیا گیا ہے جو ہندوؤں اور انگریزوں نے اسلام پر لگائے تھے۔

ان کی ایک نظم ''کیا اسلام تلوار کے زور سے پھیلا'' میں ان کا استدلال یہ تھا کہ دنیا کے دیگر مذاہب کے افراد بالخصوص آریاؤں اور عیسائیوں کا خیال ہے کہ اسلام کی قوت پوری دنیا میں طاقت کے ذریعے پھیلی ہے۔مگر ان کا یہ خیال غلط ہے۔تمنا عمادی

کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے پاس خنجرِ آہن نہیں بلکہ خنجرِ اخلاق تھا جس نے پوری دنیا کے لوگوں کو اپنے دامن میں سمولیا:

بن گئی تھی دھاک ایسی بانیِ اسلام کی — جس کی جانب اٹھ گئیں نظریں سراس کا اٹھ گیا
ہاں مگر تھی تیغ، تیغِ آہنی ہر گز نہ تھی — خنجرِ اسلام ہر گز خنجرِ آہن نہ تھا
راستی کی تیغ تھی جو تھی مسلمانوں کے پاس — خنجرِ آہن نہ تھا وہ خنجرِ اخلاق تھا [۲۷۲]

اسی نظم میں موجود قطعے میں انھوں نے مسلمانوں کی حالت زار بیان کرتے ہوئے تاسف کا اظہار کیا ہے:

کیوں کر مٹا دیں امتِ خیر الوریٰ کا نام — اب تو ہے یہ عیاں کہ یہی سب کے جی میں ہے
اس قوم پر ہجومِ بلا دیکھ دیکھ کر — احباب کو ملال ہے دشمن خوشی میں ہے
کیا جانیں روزِ حشر کب آنے کو ہے مگر — محشر بپا تو آج ہی دینِ نبی میں ہے [۲۷۳]

مولانا تمنا عمادی نے اپنی نظم ''دنیاے اسلام'' میں عالمی حالات کی منظر کشی بھی کی ہے۔ اس نظم میں انھوں نے کہا ہے کہ میں جب عالم اسلام کی حالت دیکھتا ہوں تو غم کی ایک پوری گھٹا سی چھا جاتی ہے۔ جہاں کہیں مسلمانوں کی حالت دکھائی دیتی ہے تو ان کا نخل تباہ و برباد نظر آتا ہے۔ پورے عالم پر اٹلی اور یورپ کی وجہ سے پیہم مصیبتیں ٹوٹ رہی ہیں:

بہت کچھ سن رہے تھے غلغلہ تہذیب یورپ کا — کہ بے تقصیر لاکھوں کٹ گئی اولاد آدم کی [۲۷۴]

اسی نظم میں ایران کی حالت پر نہایت دکھ اور رنج کا اظہار کیا ہے۔

کلیجا منہ کو آتا ہے خیالِ حالِ ایراں سے — کہاں تک روئیے ابتر ہے حالت چشمِ پرنم کی
ادھر گلیوں میں بہتے ہیں لہو اعیانِ دولت کے — ادھر سڑکوں پہ لاشیں ہیں بزرگانِ مکرم کی
دہائی ہے دہائی ہے ! خبر لو یا رسول اللہ — کمائی لٹ رہی ہے حضرتِ فاروقِ اعظم کی [۲۷۵]

مولانا تمنا عمادی صرف شاعر ہی نہیں عالم دین بھی تھے۔ اسی لیے ان کی نظموں میں دنیاے اسلام پر جاری مصیبتوں اور کشت وخوں کے بارے میں گہرے تاسف کے ساتھ مسلمانوں کی حالت زار پہ نہایت تکلیف دہ انداز میں شکوہ بھی ملتا ہے۔ ان کی ایک نظم ''اسلام اب کہاں رہتا ہے'' میں مسلمانوں کے اخلاقی زوال اور انحطاط کے ان پہلوؤں کی جانب اشارہ ملتا ہے جن کی وجہ سے آئین ملت ٹکڑے ٹکڑے ہوا۔ اس نظم میں مسلمانوں کی مساجد، دولت کدوں کا اور گھروں کے بارے میں ان رویوں کی بھی نشاندہی کی گئی ہے جس سے امت مسلمہ کا وقار مجروح ہوا ہے۔

کھینچ کر ایک آہ اس نے تھام کر ہاتھوں سے دل — کیا کہوں کیوں کر سنایا یہ جواب جاں گسل

میں فرشتہ ہوں نہ جن وانس اک ناکام ہوں　　میں زمانے کا ستایا مذہبِ اسلام ہوں
اب جگہ ملتی نہیں لوگوں کے دولت خانوں میں　　اس لیے رہتا ہوں چھپ کر میں انھیں ویرانوں میں ۲۷۶

انجمنِ ہلالِ احمر کا کردار اتحادِ اسلام کے حوالے سے ہندوستان میں نمایاں رہا ہے اس نے نہ صرف ترکی کے مسلمانوں کی مدد کی بلکہ اس کے کاموں سے مسلمانوں میں پائی جانے والی اخوت کو بھی مہمیز ملی۔ اسی لیے ہندوستان کے تمام علماءِ دین نے اس کے کاموں میں حصہ لیا ہے۔ تمنا عمادی نے بھی ایک نظم ''ہلال احمر'' لکھی ہے جس میں اتحاد اسلامی کے مزاج کو مدنظر رکھتے ہوئے مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ بیان کی ہے۔ اس نظم میں ان مقامات کے نام بھی لیے ہیں جو کسی زمانے میں عظمت کے مینار رہے۔ ان کی نظموں میں مسلمانوں کو درپیش تکالیف کا اظہار ہوتا ہے اور ایک دردمند دل کس طرح ان حالات کو دیکھ رہا ہے اس کی صورت حال ان کی شاعری میں بدرجہ اتم موجود ہے:

سر مسلمانوں کے تھے اور خنجرِ اخگر فشاں　　جس جگہ دیکھا لہو کا ایک دریا تھا رواں
گھٹتے گھٹتے تو ہوا تھا ماہ کامل سے ہلال　　اور بھی ان آفتوں نے کردیا اس کو نڈھال
یہ دکھانے کو کہ کیسی حالتِ اسلام ہے　　اب ہلالِ سرخ نقشِ رایتِ اسلام ہے ۲۷۷

اردو ادب میں جنگ طرابلس کے حوالے سے کئی پہلوؤں پر شاعری ملتی ہے۔ تمنا عمادی نے بھی ''طرابلس کی ایک بے کس ستم رسیدہ عورت کی مناجات'' میں ملتِ اسلامیہ کی بے یقینی کی صورت حال کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے ان کا کہنا ہے کہ مسلمانوں میں جاں نثاری کا جوش ابتدا ہی سے موجود ہے۔ ایک وقت ضرور آئے گا جب ہم ان یورپی قوتوں کو شکستِ فاش سے دوچار کریں گے۔ اس نظم میں عورت کی مناجات کی صورت میں ملت کے زخم رسیدہ وجود کی تفصیل بیان کی گئی ہے:

آپ کی ملت پہ جب وقت آپڑا　　بے تامل سب کو قربان کردیا
سب کو وارا مذہبِ اسلام پر　　جانیں دے دیں آپ ہی کے نام پر
یا نبی ! صرف ان کی حالت پر ہو رحم　　نو اسیرانِ مصیبت پر ہو رحم
آپ اگر چاہیں تو ساماں ہیں بہت　　اور ابھی بھائی مسلمان ہیں بہت ۲۷۸

رسالہ ''تمدن'' کی دسمبر ۱۹۱۲ء کی اشاعت میں ایک قطعہ میں مسلمانوں کی حالت زار کو یوں بیان کیا ہے۔

مگر یہ قومِ مسلماں کچھ ایسی ہے قلاش　　نہ اس کے پاس حکومت نہ رتبہ ہائے بلند
نہ اس کے پاس ہے تیغ و سنانِ دشمن کش　　نہ اس کے پاس کمان وکمندِ دشمن بند

پھر ایسی زیست ہے کیوں کر نہیں وبال اس پر　　یہ بے حیائی کا جینا ہے کیسے اس کو پسند ۲۷۹

تمنا عمادی کی ایک نظم ''اپنا ترانا'' ملی احساس اور شکست و ریخت میں حوصلہ افزا پیغام لیے ہوئے ہے انھوں نے اس نظم میں لکھا ہے کہ ہمارا نام و نشان صفحۂ ہستی سے کبھی نہیں مٹے گا۔ یہ تو نور کے حرفوں سے رقم ہونے والی چیز ہے۔ ہم یورپی لوگوں کی طرح ظلم و ستم کرنے والے نہیں ہیں۔ جب تک ہم حاکم رہے محکوم پر ہمارا دست کرم رہا۔ یہ الگ بات ہے کہ زمانے کی گردش کی وجہ سے دنیا میں ہم پر تباہی چھائی ہوئی ہے۔ لیکن وہ وقت دور نہیں جب ہم عرب و عجم میں دوبارہ اپنی ناکامی کو کامیابی میں تبدیل کر دیں گے:

یہ ہو سکتا ہے اب بھی پھر ہمیں اقبال و دولت ہو　　یہ ممکن ہے کہ واپس پائیں پھر جاہ و حشم اپنا
اگر اللہ نے چاہا تو کل افرادِ عالم کو　　دکھادے گی اثر پھر سطوتِ خیرالامم اپنا
جہاں چاہیں گے جھنڈا گاڑ دیں گے اپنی سطوت کا　　کوئی کیوں ہم کو روکے گا عرب اپنا عجم اپنا
فلک تک گونج اٹھے گا نعرۂ اللہ اکبر سے　　تمنا جوش میں جس دن اٹھالیں گے علم اپنا ۲۸۰

مولانا تمنا عمادی نے ان نظموں کے علاوہ غزلیں اور نعتیں بھی لکھی ہیں۔ ان کی غزلوں میں بھی ملی احساس نمایاں ہے:

آج اللہ میرے ضبط کی عزت رکھ لے　　ہو نہ فریاد حریفِ لب خاموش کہیں
پھر کہیں دفترِ عصیاں کا پتا بھی نہ ملے　　تیری رحمت کے جو دریا میں اٹھے جوش کہیں ۲۸۱

انھوں نے جو نعتیہ اشعار کہے ہیں ان میں رسول اکرمؐ سے محبت و عقیدت کا تاثر نمایاں نظر آتا ہے۔ ایک نعت جس میں سراپائے نبی کریم صلعم کو بیان کیا گیا ہے:

چہرہ کی آب و تاب سے ہے چاند بھی خجل　　خورشید الگ ہے سر بہ گریبان و منفعل
گل زار میں ہے رشک سے ہر پھول مضمحل　　شمشاد ہے جدا غمِ قامت سے پابہ گل
کیا پہنچے کوئی عارض پر نورِ شاہ کو　　خورشید کو تو ہے یرقاں، برص ماہ کو ۲۸۲

اسی طرح ان کی ایک نظم ''ھل جزاء الاحسان الا الاحسان'' ہے جس میں انھوں نے مسلمانوں کو اس بات کی تلقین کی ہے کہ وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ عمدہ سلوک کا مظاہرہ کریں اس کے نتیجے میں علم و عمل اور معاشرہ میں اخوت کو پروان چڑھنے کے بہتر امکانات پیدا ہوں گے۔ اس نظم کا ایک بند یہ ہے:

تو میں نے کہا اس سے اے خوش خصال　　سراپا غلط ہے ترا یہ خیال
ہے قرآن میں صاف لکھا ہوا　　کہ احساں ہی احسان کی ہے جزا ۲۸۳

مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی: (۱۸۶۰ء۔۱۹۲۶ء)

مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی کی نظم ''زمانہ اور اسلام'' پچاس بندوں پر مشتمل ہے۔ انھوں نے حالی کے تتبع میں یہ نظم لکھی اور اس کا لہجہ بھی حالی سے ملتا جلتا ہے۔ لیکن معنوی اعتبار سے اس میں فرق پایا جاتا ہے۔ شرر نے تمثیلی اسلوب اختیار کیا ہے اس میں قصہ پن بھی ہے اور اس کا انداز ناولوں جیسا ہے۔ اس میں رومانی فضا اور تخیلی دنیا آباد ہے۔

اس نظم میں زمانہ متشخص ہو کر ترقی اسلام کی راہ میں نکلتا ہے۔ جس سے اس کو گیارہ سو سال پہلے عشق ہو گیا تھا اور ایک مدت تک اس کی خدمت میں باریاب رہنے کے بعد یورپ کی سیر کو چلا گیا تھا۔ ایک دن اچانک اس کو اپنی محبوبہ کا خیال آتا ہے اور وہ اس کی تلاش میں نکل پڑتا ہے۔ لیکن اس کا ٹھکانہ کہیں نہیں ملتا۔ ایک طوفانی رات میں خوفناک جنگل میں ہمت ہار دیتا ہے۔ اس وقت ایک درویش صفت بزرگ نمودار ہوتے ہیں۔ زمانے کو ایک کھنڈر میں لے جاتے ہیں۔ زمانہ ان سے حال بیان کرتا ہے۔ درویش اسے بتاتے ہیں کہ وہ جس محبوب کی تلاش میں سرگرداں و پریشاں ہے وہ ادبار و امتداد کا شکار ہو چکا ہے۔ دولت و حشمت نے اس سے آنکھیں پھیر لیں ہیں۔ اس کا قصر تباہ ہو گیا۔ اب یہی کھنڈرات اس کی نشانی ہیں۔ یہ سن کر زمانہ اور درویش دونوں رونے لگتے ہیں۔ اس منزل پر شاعر برآمد ہوتا ہے اور تلقین کرتا ہے کہ رونا دھونا بہت ہو چکا اب وقت کا تقاضہ پورا کرو۔ سب مل کر اسلام کی گزشتہ عظمت واپس لانے کی جدوجہد کرتے ہیں: ۲۸۴

غضب حسن تھا اس بتِ دل ربا کا — تھا اس روئے تاباں سے اک رعب پیدا
کھڑا آگے اقبال تھا دست بستا — جبیں پر تھا اک خوش نما تاج رکھتا
چمکتے تھے حرف اس میں ہیرے سے بڑھ کر — ترقی اسلام لکھا تھا اس پر ۲۸۵

شرر ملت اسلامیہ کا درد رکھتے تھے۔ ان کے تاریخی ناولوں میں بھی قوم کو بے دار کرنے کا منظر نامہ موجود ہے۔ ''زمانہ اور اسلام'' میں انھوں نے جذبات و کیفیات کو ہی آئینہ نہیں بنایا بلکہ ایک قوم کی مکمل داستان عروج و زوال بیان کر دی ہے۔ مسلم قوم کی تباہ شدہ حالت کا ادراک شرر کے سامنے موجود تھا اس نظم میں انھوں نے عروج کی داستان سنائی ہے تاکہ مسلمانوں کی خود درای اور عزت نفس کو ابھارا جائے۔ انھیں ان بھولے ہوئے اسباق کی یاد دلاتے ہوئے فکر و عمل کے لیے آمادہ کیا جائے۔ یہ نظم دلِ دردآشنا کے لیے ایک مرثیے کا حکم رکھتی ہے اور عقلِ سلیم کے لیے دعوتِ فکر اور سرچشمۂ ہدایت ہے: ۲۸۶

مسلمانو! افسوس و عبرت کی جا ہے — زمانہ غمِ قوم میں مبتلا ہے
تمھیں ڈھونڈتا دربدر وہ پھرا ہے — بڑی مشکلوں سے لگایا پتا ہے

بہت رو چکے رونے والے، اٹھو اب　　زمانہ جو کہتا ہے وہ ہی کرو اب ۲۸۷

شرر کی یہ نظم فرسودہ نظامِ معاشرت کی مدلل ہجو ہے۔ اس میں انھوں نے عروج و زوال کی تصویر کھینچی ہے۔ اس کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ ملت اسلامیہ کے فکر و عمل میں وسعت لانے کے خواہاں تھے۔ اس نظم کا ذکر اتحاد اسلامی اور ملی احساس کے تناظر میں کہیں نہیں کیا جاتا ہے، جب کہ اس وقت کے مسلمانوں کی سیاسی اور معاشرتی انتشار کے حل کے لیے یہ نظم اہمیت رکھتی ہے۔ مسلمانوں کی عظمت و شوکت کو یوں بیان کیا ہے:

ممالک تھے سب زیرِ فرمان اس کے　　دہلتے شہنشاہ تھے اس کے ڈر سے
جھکائے تھیں قومیں تو سر اس کے آگے　　مذاہب تھے جو دست بستہ کھڑے تھے
ہوا بن گئی تھی زمین و زماں میں　　تھی اک دھاک سی بیٹھی سارے جہاں میں ۲۸۸

شرر کی تحریروں اور ان کی نظموں کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اسلام قوموں اور جماعتوں کے اختلافات اور تعصبات کو مٹا کر ان میں عالم گیر اخوت قائم کرنا چاہتا ہے، تاکہ علم و ادب کے ایک نئے دور کا آغاز کیا جائے۔

شرر نے اردو نظم نگاری میں ہیئت کے کچھ نئے تجربات بھی کیے ہیں۔ انھوں نے اردو میں سب سے پہلے نظم معریٰ اور آزاد نظم کا تجربہ کیا۔ انھوں نے شاعری کی جانب خصوصی توجہ نہیں دی مگر چند نظمیں ان کی عمدہ ہیں۔ جن میں ''شب وصل''، ''شب غم''، ''زمانہ اور اسلام''، ''فلورنڈا''، ''مظلوم ورجینا'' اور ''اسیری بابل'' قابل ذکر ہیں۔

نظم ''شب غم'' میں بھی انھوں نے ملتِ اسلامیہ کی غفلت کو موضوع بنایا ہے۔ وہ عالمِ اسلام کی حالت دیکھ کر کہتے ہیں کہ اب رونے اور رلانے کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ مسجد والوں کو اور منبر والوں کو اٹھانے کی ضرورت ہے:

لاکھ طرح سے دل بہلایا　　چین کسی عنوان نہ آیا
سب کو اٹھایا سب کو جگایا　　کوئی بھی ہم دم ہائے نہ پایا
تھی اک شمع جو حالِ شرر پر　　آٹھ آٹھ آنسو روئی شب بھر ۲۸۹

شرر کی تاریخی نظم نگاری کا اصل محرک وہ خوں چکاں حالات تھے جن سے ملت اسلامیہ دوچار تھی۔ انھوں نے مسلمانوں کو اتحاد اسلام کا درس دیا اور کہا کہ اس کی برکت سے ہم مسلمان فکر و عمل کی دنیا میں انقلاب برپا کر سکتے ہیں۔

صفی لکھنوی: (۱۸۶۲ء۔۱۹۵۰ء)

صفی لکھنوی اساتذہ غزل میں ایک اونچا مقام رکھتے تھے۔ غزل گوئی کے باوجود اپنی ولولہ انگیز نظموں کے ذریعے ملت کے

خوابیدہ شعور کو بے دار کرنے میں کوشاں رہے۔ان کی قومی نظموں کا مجموعہ لخت جگر اسلامی ذہن وفکر کا احساس لیے ہوئے ہے۔ان کی نظمیں قوم کی ترجمان بن کر احساس وفکر کو جلا بخشنے کا کام دیتی ہیں۔

صفی لکھنوی نے ۱۹۱۲ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس، جو لکھنو میں منعقد ہوا تھا میں جو نظم پڑھی وہ آج بھی تازگی لیے ہوئے ہے اس نظم سے انگریز حکام بھی کافی نالاں ہوئے اور ان پر دباؤ بھی ڈالا گیا۔

مغرب کی استعماری قوتوں نے بلاد اسلامی کی بیخ کنی جس انداز میں شروع کی تھی اس سے ہر خاص وعام متاثر تھا اس لیے شاعروں کے یہاں دول یورپ کے جارحانہ رویوں پر شدید ردعمل دیکھا گیا ہے۔صفی لکھنوی کی یہ نظم اسی شدید ردعمل کا ایک ایسا نمونہ ہے جس کی گونج اب بھی سنائی دیتی ہے۔صفی نے اس نظم کے ذریعے استعماری قوتوں کو یہ بتا دیا تھا کہ اسلام کے محافظ تمھارے اس ظلم و ستم سے دبنے والے نہیں ہیں:

زندہ ہیں اگر زندہ دنیا کو ہلا دیں گے — مشرق کا سرا اٹھ کر مغرب سے ملا دیں گے
دھارے میں زمانے کے بجلی کا خزانہ ہیں — بہتے ہوئے پانی میں ہم آگ لگا دیں گے
ہم سینۂ ہستی میں انگارہ ہیں انگارہ — شعلے بھڑک اٹھیں گے جھونکے جو ہوا دیں گے
ہم کون ہیں ہم کیا ہیں ہم کچھ بھی نہیں لیکن — وقت آنے دو وقت آئے پھر تم کو بتا دیں گے
دنیا کے سمندر میں ہم جزر بھی ہیں مد بھی — دیکھو جو ہمیں روکا طوفان اٹھا دیں گے
ایران ہو یا ترکی دونوں کو مٹا دیکھیں — کیا صفحۂ ہستی سے اسلام مٹا دیں گے
اس دین کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے — اتنا ہی یہ ابھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے
گونجیں گی پہاڑوں میں تکبیر کی آوازیں — یہ صور جہاں پھونکا مُردوں کو جلا دیں گے ۲۹۰

صفی لکھنوی کی اس نظم کے علاوہ شیعہ کانفرنسوں میں پڑھی گئی نظمیں بھی اہمیت کی حامل ہیں۔اس نظر سے اگر دیکھا جائے تو صفی لکھنوی کی نظموں میں پائے جانے والے خیالات عمرانی اور سیاسی نوع کے ہیں اسی کے تحت انھوں نے اپنی نظموں میں شیعہ اسکول و کالج کھولنے کی تلقین کی اور اس مقصد کے حصول کے لیے اپنی شاعری کے ایک حصے کو وقف کر دیا۔۲۹۱

اشتیاق سلونوی: (۱۸۷۸ء)

اشتیاق سلونوی نے مسلمانانِ عالم کو خواب غفلت سے جگانے کے لیے، جوشِ اسلامی اور غیرتِ قومی سے بھرپور نظمیں لکھی تھیں۔اشتیاق سلونوی ۱۸۷۸ء میں قصبہ سلون شریف ضلع رائے بریلی میں پیدا ہوئے اور ابتدائی عمر میں ہی شاعری شروع کر دی۔

تقریباً تمام اصنافِ شاعری پر طبع آزمائی کی ہے۔ان میں سیاسی، قومی اور ملی مضامین کی تعداد نمایاں ہے۔

ان کی شاعری کا ایک مجموعہ ''درد دل'' کے نام سے شائع ہوا تھا جس میں عالم اسلامی کے حالات پر مبنی نظمیں شامل تھیں۔ اس کتاب کے پہلے حصے میں چار طویل نظمیں ہیں۔''حالت الاخوان''، ''انقلاب زمانہ''، ''گریہ دل'' اور ''نوحہ اسلام'' کے عنوانات سے مسلمانوں کی سیاسی، تہذیبی اور علمی حالات پر تبصرہ کیا ہے۔دوسرے حصے میں چھوٹی چھوٹی قومی اور ملکی نظمیں ہیں۔مگر پہلا حصہ اہم ہے اس میں حالی کی نظم ''مسدس'' اور اقبال کی نظم ''شکوہ'' کے اثرات نمایاں ہیں۔

ان نظموں میں سوز و گداز اور دلی جذبات پائے جاتے ہیں۔انھیں پڑھ کر مسلمانوں کی اس وقت کی موجودہ معاشرتی بے چینی کا نقشہ ذہن میں ابھر آتا ہے۔ان کی نظم ''حالت الاخوان'' مسلمانوں کے ہر طبقے اور ہر شعبہ زندگی کی کیفیت کو ظاہر کرنے کے علاوہ موثر انداز میں شاعر کی بے کلی کو بھی پیش کرتی ہے۔اس نظم میں زبان کی دل کشی اور سلاست نمایاں ہے:

غفلت سے تجھے کام بس اب صبح و مسا ہے　　نمبر ترا افسوس ہر اک شے میں گھٹا ہے
اب بھی تو ذرا دیکھ کہ حالت تری کیا ہے　　اے قوم ترے سر پہ عجب وقت پڑا ہے
ادبار کی چھائی ہوئی اب تجھ پہ گھٹا ہے

اس کے بعد شاعر اسی نظم میں مسلمانوں کے زوال کی تصویر کشی کرتے ہوئے ان عوامل کی جانب اشارہ کرتا ہے جنھوں نے اسے اس نہج پر پہنچا دیا۔ان کا کہنا ہے کہ مسلمانوں نے اسلام سے اور علم و ہنر کی راہوں کو جس طرح ترک کیا ہے اس نے ان کا اقبال گہنا دیا ہے:

اسلام کا گلشن کبھی پامال نہ ہوتا　　اس طرح سیہ نامۂ اعمال نہ ہوتا
بر گشتہ و دشمن کبھی اقبال نہ ہوتا　　غافل جو نہ ہم ہوتے تو یہ حال نہ ہوتا
تقصیر کسی کی نہیں یہ اپنی خطا ہے[۲۹۲]

نظم ''انقلاب زمانہ'' کے اکثر بند ایسے ہیں جن میں مسلمانوں کی گذشتہ عظمت کی نشانیاں پیش کی گئی ہیں۔شاعر ایک ناصح مشفق کی طرح نصیحت کرتا ہے کہ مسلمانوں نے اگر اپنے سنہری اصولوں کو دوبارہ زندگی بخشنے کی کوشش نہیں کی تو دنیا میں ذلیل و رسوا ہوتے رہنا ان کا مقدر بن جائے گا۔دین اسلام کی ہمہ گیر تعلیمات کو فراموش کرتے رہنا ہی انقلابِ زمانہ ہونے کی بنیادی وجہ ہے:

ہماری شوکت و عظمت سے اک عالم لرزتا تھا　　ہمارے دبدبہ سے خائف و لرزاں نصاریٰ تھا [۲۹۳]

شاعر موجودہ حالت دیکھ کر ملول ہو جاتا ہے اور مسلمانوں کی حالت زار کو یوں بیان کرتا ہے:

ہمارا اعتبار اب کوئی دنیا میں نہیں کرتا　　عبث بدنام دینِ حق اس امت کی بدولت ہے

ترقی پر ہماری جس طرح دنیا کو حیرت تھی — یوں ہی اب اس تنزل پر زمانے بھر کو حیرت ہے
ہماری ہر طرح اب قابل افسوس حالت ہے — مگر اس پر بھی ساری قوم مستِ خوابِ غفلت ہے [۲۹۴]

نظم ''نوحہ اسلام'' میں مسلمانوں کے زوال اور خلافت عثمانیہ کے تار و پود بکھرنے پر رنجیدہ ہیں۔ وہ مسلمانوں کی گرتی ہوئی ساکھ اور اس کی شان و شوکت کے خاتمے پر دل گرفتہ ہو کر اپنے جذبات کا اظہار اس نظم میں کرتے ہیں:

اک جنازے کو لیے جاتے تھے کل جانبِ گور — آگے وہ پیچھے رواں خلق مچاتی ہوئی شور
ساتھ ساتھ اس کے مسلمان نحیف و کمزور — غالباً ہوں گے وہ تعداد میں چالیس کروڑ
ان کی آہوں سے جگر غیر کا شق ہوتا تھا — تھام لیتے تھے کلیجہ یہ قلق ہوتا تھا
پہلے پایہ کو تو اقبال دیے تھے کاندھا — دوسرا دولت و عزت کو بدلتے دیکھا
علم و فن دونوں کو مصروف اسی میں پایا — ساتھ سر پیٹتی جاتی تھی سیاست اپنا
پوچھا اک شخص سے کیا مجمعِ ناکام ہے یہ — مجھ سے لوگوں نے کہا مجمعِ اسلام ہے یہ [۲۹۵]

ہاشمی فرید آبادی:

تحریک اتحاد اسلامی کا ثمر یہ بھی ہے کہ اردو شاعری میں بین الاقوامی حالات کو موثر انداز میں بیان کرنا آسان ہو گیا۔ پہلی بار ایک منظم انداز فکر کے ساتھ شاعروں نے مذہب کے حوالے سے مسلمانوں کو مجتمع ہونے کی دعوت دی۔ مسلمان بھائیوں کی تکالیف کو محسوس کر کے شاعرانہ اظہار اور مسلمانوں سے جذبہ ہمدردی کا آغاز ہوا۔ پھر حکومت وقت کے خلاف جس سیاسی شعور کا مظاہرہ شاعری میں اس تحریک کے اثر سے پیدا ہوا اس نے کئی ایسی نظموں کو بھی تخلیق کیا جو فی زمانہ اپنے انداز اور آہنگ کے اعتبار سے اردو شاعری میں اپنا مقام رکھتی ہیں۔

ہاشمی فرید آبادی کی نظم ''چل بلقان چل'' کو پان اسلامزم کے مطالعے میں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ نظم علی گڑھ میں انھوں نے اس وقت کہی جب ڈاکٹر انصاری طبی وفد لے کر ترکی روانہ ہونے والے تھے۔ اس کے لیے ہندوستان کے نوجوانوں میں عمومی جوش پایا جاتا تھا۔ اس نظم میں موجود اپیل ہندوستان بھر کے مسلمانوں میں حرارت پیدا کر رہی تھی۔ دسمبر ۱۹۱۲ء کے شمارے میں الناظر لکھنو کے ایڈیٹر لکھتے ہیں کہ:

> ''ڈاکٹر انصاری کے طبی مشن میں لکھنو کے لوگ بھی شریک ہیں اور ترکی مجاہدین کی مرہم پٹی کرنے قسطنطنیہ جا رہے ہیں۔ یہ جمعیت یکم دسمبر ۱۹۱۲ء کو بمبئی سے لائڈ نامی جہاز پر روانہ ہو جائے گی۔ ہم ان گوناگوں جذبات کے اعادہ

سے قاصر ہیں جو برادر عزیز کو رخصت کرتے وقت ہمارے دلوں میں موج زن تھے مگر پھر بھی ان کی حالت پر اظہار رشک کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔''۲۹۶

اس مشن کے حوالے سے یہ بات اہم ہے کی اٹلی کے جہاز ایس ایس سرڈینیا S.S Sardinia کو بمبئی کی وکٹوریہ گھاٹ پر مشاہیر کی موجودگی میں الوداع کہا گیا۔ان مشاہیر میں محمد علی ،ظفر علی خان ،میاں محمد حاجی جان محمد چھوٹانی، فضلی بھائی ایم چنائے، کرم بھائی ایم چنائے ،اور ترکش قونصل جرنل موجود تھے۔مشن کے اراکین خاکی وردی میں ملبوس تھے اس وردی کا اسٹائل ترکی فوجی طبی وفد سے مماثل تھا۔

اسی رسالے میں ہاشمی فرید آبادی کی یہ نظم شائع ہوئی جو ایک تاریخی واقعے کا منظوم بیان ہے۔یہ نظمیں حادثاتی ہونے کے باوجود تاریخی واقعات کا کامل بیان ہیں فرید آبادی نے اس نظم میں جذباتی انداز اختیار کیا ہے:

تابہ کے رخ زرد آنکھیں خوں چکاں دل مضمحل — تابہ کے سازِ جنوں مشتاقِ آہنگ برعمل
دعویٰ ایماں رکھتا ہے تو اے مومن نکل — شمہ غیرت کا ہے گر باقی تو چل بلقان چل
جان سے لاکھوں گنی مہنگی ہے تیری آبرو — ہو فنا گر ہے بقائے جاوداں کی آرزو
سوگواری ہائے ظاہر کی نہ کر تلقین تو — شمہ غیرت کا ہے گر باقی تو چل بلقان چل
چھوڑ دے بے روح لوگوں کے لیے یہ اعتدال — موت حاصل کر کہ جو اس زندگی کا ہے کمال
مشکلیں کس کی؟ کہاں کی روک؟ اور کیسا مآل — لطف مرنے کا اگر چاہے تو چل بلقان چل
تا کجا یکساں روی اب سن پیامِ انقلاب — چھوڑ بے رنگی سکوں کی ہو رہینِ اضطراب
وہ بھی کیا مرنا کہ خود فطرت تجھے دے دے جواب — لطف مرنے کا اگر چاہے تو چل بلقان چل ۲۹۷

ہاشمی فرید آبادی کی شاعری کو تا حال سنجیدگی سے موضوع نہیں بنایا گیا ہے۔ان کی ایک کتاب ''سہ نظمِ ہاشمی'' ہے جس میں متعدد تاریخی واقعات وشخصیات پر نظمیں شامل ہیں ۔اس کے علاوہ ان کی نظمیں اور قطعات'' الناظر'' رسالے میں چھپتی رہی ہیں۔'' جذبات ہاشمی'' نامی نظم'' الناظر'' جنوری ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی جس میں انھوں نے حسن وعشق کے پرانے خیالات کو پیش کیا ہے۔ان کی نظم'' ناگن'' کو کافی شہرت حاصل ہوئی ہے۔اسی طرح مارچ اپریل ۱۹۳۶ء میں بھی ایک قطعہ شائع ہوا تھا جس میں ملّی احساس نمایاں صورت میں دکھائی دیتا ہے:

دقیقِ فکر، نگہ تہ نگر ، زباں بے باک — چمن کے روپ کو کہتا ہوں صنعتِ خاشاک

کسی کے رتبۂ عالی کا رعب کیا مانوں　　جب اک فریبِ تخیل ہے رفعتِ افلاک
نہ خوفِ جور سے مردہ ہوا ہے جذبۂ حق　　نہ حرصِ جاہ سے غیرت ابھی ہوئی ہے ہلاک ۲۹۸

علی گڑھ تحریک کے بعض حامیوں کے نزدیک تحریک اتحاد اسلامی ایک فضول نعرہ تھا اس کے باوجود اسی یونی ورسٹی کے طلبہ نے اسے پورے ہندوستان کے مسلمانوں کی آواز بنادیا۔ خود ہاشمی فرید آبادی نے طالب علمی ہی کے دوران نظم ''ٹریپولی'' لکھی۔ جس میں طرابلس الغرب کے مسلمانوں کی دردناک صورت حال بیان کی ہے انھوں نے کہا ہے کہ اس جنگ کے نتیجے میں امتِ خیر البشر گرفتار بلا ہوگئی اور اس کا کارواں دوبارہ شیرازہ بندی کا منتظر دکھائی دیتا ہے:

دیدۂ بیم و رجا کس بات کا ہے منتظر　　ڈالتا کیا ہے تریپولی پہ حسرت کی نظر
یاں بنایا جائے گا مرقد تری ناموس کا　　یاں نشاں ہوگا تری ذلت، ترے افسوس کا

پھر انھوں نے اسی نظم میں دین احمدی کی اس طرح ذلت و رسوائی پر افسوس کرتے ہوئے مسلمانوں کی بے حسی کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

کیا یہ سچ ہے دین احمد کا نچا دل اور جگر　　کیا دعائیں کلمہ گویوں کی گئیں سب بے اثر
کیا ابھی تک قبر سے باہر نہیں نکلا عمر　　تا کہ دیکھے مومنوں کے خاک وخوں آشفتہ سر
انہدامِ کوشکِ توحید اٹھ کر دیکھ لے　　اور دریدہ روضۂ اطہر کی چادر دیکھ لے ۲۹۹

ہاشمی فرید آبادی کی نظم بہ عنوان ''بس اب ہے آج سے آغاز میری کارفرمائی'' ہے۔ اس نظم میں انھوں نے انگریزوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہم مسلمان بہت دنوں سے اس ظلم وستم اور ناانصافی کو سہتے رہے ہیں مگر اب ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ ہم نے اپنے وجود پر سیاسی اور تہذیبی غلامی کا جو طوق پہن رکھا تھا اسے اب اتار دیں گے۔ اس نظم میں ان کا لہجہ کافی حد تک حاکمانہ ہے اور انھوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ اب اس سرزمین کے ہم ہی سلطانِ مطلق ہیں:

بہت سمجھا کیا میں صبر و خاموشی کو دانائی　　بہت کہتا رہا میں کچھ نہ کرنے کو شکیبائی
بہت دن ذلتوں کو مصلحت جانا کیا لیکن　　بس اب اے ہم نشیں میری طبیعت جوش پر آئی
بھڑک ہے نبض میں پیدا تڑپ ہے قلب میں ظاہر　　نفس میں سانپ کی پھنکار ہے بھوبل کی گرمائی ۳۰۰

اس نظم کے آخر میں انھوں نے مسلمانوں کو غیرت دلاتے ہوئے کہا تھا کہ ہمیں اپنے اندر خود اعتمادی پیدا کرنے

کی ضرورت ہے تاکہ ہم دنیا میں دوبارہ سرخروئی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں:

بیک ہیجان خوں پارا ہوا ملبوس نامردی — مجھے خود اعتمادی نے پنھایا تاجِ دارائی
بس اب میں آج اپنے ملک کا سلطان مطلق ہوں — بس اب ہے آج سے آغاز میری کارفرمائی ۳۰۱

عزیز لکھنوی:

عزیز لکھنوی کی غزلوں اور نظموں میں اتحاد اسلامی کے تصورات اور نظریات ملتے ہیں۔ انھوں نے بھی مسلمانوں کی جاں بلب حالت کو دیکھ کر گہرے دکھ اور رنج کا اظہار کیا ہے۔ اپنے وقت کے بہترین شعرا میں شمار کیے جاتے تھے۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کی اس خراب حالت کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مسلمان خدا اور رسول کے احکام سے روگردانی کر چکے ہیں۔ انھوں نے اپنی نظم ''آہ رسا'' میں اس پہلو پر یوں اظہار کیا ہے:

کہاں جاتے ہو قومِ جاں بلب کو چھوڑ کر تنہا — بھرے آتے ہیں آنسو اور دم بھر دیکھتے جاؤ
ہماری شکوہ سنجی پر یہ کہنا کیا قیامت ہے — دکھاتا ہے ابھی کیا کیا مقدر دیکھتے جاؤ ۳۰۲

بنارس میں مسلمانوں کی ایک انجمن تہذیب الاخلاق کے نام سے قائم ہوئی تھی جس کے غراض و مقاصد کے نمایاں پہلو یہ تھے کہ اسلام کے اہم واقعات پر فلسفیانہ نظر ڈالنا اور ان خیالات کی تردید کرنا جو اسلام پر اعتراض کی صورت میں وارد ہوتے ہیں۔ اپریل ۱۹۱۱ء کو اس انجمن نے بنارس میں ایک عظیم جلسہ منعقد کیا جس میں مسلمانوں کے تمام مکاتب فکر کے علما شریک ہوئے۔ اس جلسہ کے آخر میں عزیز لکھنوی نے ایک عمدہ نظم ''اشاعت اسلام'' کے نام سے پڑھی۔ نظم نے جلسے میں جوش و خروش پیدا کر دیا تھا۔ اس کے چند اشعار یہ ہیں:

کب ہوا اسلام رائج قوتِ شمشیر سے — بلکہ اخلاقِ حسن سے صلح جو تدبیر سے
موعظت سے، پند سے، الہام سے، تقریر سے — نعرۂ تہلیل سے، آوازۂ تکبیر سے
باطنی تھی اک کشش ان کے دلِ پر جوش میں — جذبِ روحانی تھا ان کی کوششِ خاموش میں ۳۰۳

عزیز لکھنوی نے اپنی ایک نظم ''نالہ دل'' میں مسلمانوں کی مذہب سے دوری اور لہو و لعب میں پڑے ہونے کی تصویر کھینچی ہے۔ انھیں اس بات پہ شدید دکھ ہے کہ ہم مسلمانوں نے اپنے اسلاف کی یادگاروں کو سنبھالنے کے بجائے اس متاع کو لٹا دیا ہے جسے تہذیب و تمدن اور دولت و ثروت سے بجا طور پر تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اب ہر طرف ممالک اسلامیہ میں ویرانی اور بربادی چھائی ہوئی ہے:

مہیا ہے تمہارے واسطے آسانیاں کیا کیا — مگر اس پر بھی تم کرتے ہو نافرمانیاں کیا کیا
بزرگوں نے ہماری جو زمیں جنت بنائی تھی — نظر آتی ہیں کوسوں دور تک ویرانیاں کیا کیا ۳۰۴

رضا علی وحشت: (۱۸۸۱ء۔۱۹۵۶ء)

رضا علی وحشت کا تعلق بنگال سے تھا۔ ۱۸ نومبر ۱۸۸۱ء میں پیدا ہوئے اور انگریزی زبان سے اچھی واقفیت رکھتے تھے۔ وحشت ہی کی شخصیت نے شبلی اور حالی کو انگریز داں طبقے سے روشناس کرایا۔ اقبال نے بھی ان کی تعریف کی ہے۔ اقبال وحشت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''میں ایک عرصے سے آپ کے کلام کو شوق سے پڑھتا ہوں اور آپ کا غائبانہ مداح ہوں دیوان قریباً سب کا سب پڑھا اور خوب لطف اٹھایا۔ ماشاء اللہ آپ کی طبیعت نہایت تیز ہے اور فی زمانہ بہت کم لوگ ایسا کہہ سکتے ہیں۔ آپ کی مضمون آفرینی اور ترکیبوں کی چستی قابل داد ہے۔'' ۳۰۵

ان کی ایک نظم مسلمانوں کی ملی حالت کا بھرپور نقشہ پیش کرتی ہے۔ اس نظم میں شاعر فریادی بن کر مسلمانوں کی زبان سے فغاں کر رہا ہے۔ اور خدا کے حضور اپنی بے قدری کا رونا رو رہا ہے:

درد سے تنگ آ کے مصروفِ فغاں ہوتے ہیں ہم — کب شکایت سنجِ جورِ آسماں ہوتے ہیں ہم
اپنی بربادی کا افسانہ ہے مشہورِ جہاں — محفلِ دشمن میں زیبِ داستاں ہوتے ہیں ہم
کھائے ہیں دھوکے بہت اے آسمانِ نیلگوں — دل کبھی ہوتا ہے خوش تو بدگماں ہوتے ہیں ہم ۳۰۶

حواشی:

۱ ڈاکٹر محمود الرحمٰن، ''جنگ آزادی کے اردو شعرا''، قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ وثقافت، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء، ص ۱۱۲۔
۲ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ''اردو شاعری کا سیاسی وسماجی پس منظر''، جامعہ پنجاب، لاہور، ۱۹۶۶ء، ص ۴۲۶۔
۳ ڈاکٹر عبادت بریلوی، سید فیاض محمود، ''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند''، نویں جلد، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۲۷۵۔
۴ ایضاً، ص ۲۷۵۔
۵ ڈاکٹر توصیف تبسم، ''جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کا مجاہد شاعر''، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، س ن، ص ۹۔
۶ ایضاً، ص ۵۱۔
۷ سعیدہ بانو، ''اردو کی دو جہادی نظمیں''، مشمولہ: سہ ماہی الزبیر ۲، تحریک آزادی نمبر، بہاول پور، ۱۹۷۰ء، ص ۱۳۰۔
۸ ایضاً، ص ۱۳۱۔

۹ ایضاً، ص ۱۳۲۔

۱۰ ایضاً، ص ۱۳۴۔

۱۱ ایضاً، ص ۱۳۵۔

۱۲ محمود الرحمٰن، ص ۱۲۷۔

۱۳ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، ''حالی کا ذہنی ارتقا''، شہرزاد، کراچی، ۲۰۰۳، ص ۱۹۵۔

۱۴ مولوی عبدالحق، ''افکارِ حالی''، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۷۶ء، ص ۷۸۔

۱۵ مولانا الطاف حسین حالی، ''کلیاتِ نظمِ حالی''، مرتبہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۸ء، ص ۴۲۔

۱۶ ایضاً، ص ۴۳۔

۱۷ عبدالحق، ص ۵۸۔

۱۸ حالی، ص ۱۰۶۔

۱۹ ایضاً، ص ۹۴۔

۲۰ ایضاً، ص ۴۴۔

۲۱ ایضاً۔

۲۲ ایضاً، ص ۹۴۔

۲۳ ایضاً، ص ۹۶۔

۲۴ ایضاً، ص ۱۲۵۔

۲۵ مصطفےٰ خان، ص ۱۹۵۔

۲۶ حالی، ص ۱۳۹۔

۲۷ ایضاً، ص ۱۴۵، اس مثال میں حالی نے ایک حدیث بھی بیان کی ہے۔ یمن کی نسبت حدیث میں آیا ہے کہ ''یعنی ایمان ہے تو یمن کا' اور حکمت ہے تو یمن کی ہے۔

۲۸ ایضاً، ص ۱۴۴۔

۲۹ ڈاکٹر جمیل جالبی، ''تاریخ ادب اردو''، جلد چہارم، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۹۳۵۔

۳۰ حالی، ص ۱۴۷۔

۳۱ ایضاً، ص ۱۶۰۔

۳۲ پروفیسر وقار عظیم، ''حالی کا شکوہ''، مشمولہ: صحیفہ، حالی نمبر، شمارہ نمبر ۵۸، لاہور، جنوری ۱۹۷۲ء، ص ۱۰۴۔

۳۳ حالی، ''کلیاتِ نظمِ حالی''، جلد دوم، مرتبہ: ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۰ء، ص ۱۱۵۔

۳۴ عظیم،ص۱۰۶۔

۳۵ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار،''ملی نشاۃ الثانیہ کا نقیب''،مشمولہ: صحیفہ،حالی نمبر،شمارہ نمبر۵۸،لاہور،جنوری ۱۹۷۰ء،ص۶۰۔

۳۶ عظیم،ص۱۰۶۔

۳۷ حالی،۱۹۷۰ء،ص۱۶۵۔

۳۸ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار،جنوری۱۹۷۲ء،ص۶۱۔

۳۹ حالی،۱۹۷۰ء،ص۸۰۔

۴۰ ایضاً۔

۴۱ افتخار احمد صدیقی،''کلیات نظم حالی''،جلد دوم،مجلس ترقی ادب،لاہور،۱۹۷۰ء،ص۸۰۔

۴۲ ایضاً۔

۴۳ حالی،۱۹۷۰ء،ص۷۶۔

۴۴ افتخار احمد صدیقی،۷۶۔

۴۵ ذوالفقار،۱۹۷۲ء،ص۶۰۔

۴۶ حالی،۱۹۷۰ء،ص۱۴۶۔

۴۷ ایضاً،ص۱۷۷۔

۴۸ الطاف حسین حالی،''کلیات نظم حالی''،جلد اوّل،مرتبہ: شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی،حالی بک ڈپو،پانی پت،۱۹۲۴ء،ص۵۴۔

۴۹ ایضاً،ص۵۵۔

۵۰ افتخار احمد صدیقی،ص۱۲۲۔

۵۱ حالی،۱۹۷۰ء،ص۱۲۲۔

۵۲ سید سلیمان ندوی،مرتبہ:''کلیات شبلی''،نیشنل بک فاؤنڈیشن،اسلام آباد،۱۹۸۹ء،ص ق۔

۵۳ ایضاً،ص ع۔

۵۴ احمد صدیق صدیقی،''شبلی کی سیاسی شاعری پر ایک نظر''،مشمولہ: ماہ نامہ ادیب،شبلی نمبر،علی گڑھ،ستمبر ۱۹۶۰ء،ص۱۷۱۔

۵۵ ایضاً،ص۱۷۱۔

۵۶ علامہ شبلی،''کلیات شبلی''،مرتبہ: سید سلیمان ندوی،نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد،۱۹۸۹ء،ص۲۹۔

۵۷ سید عبداللہ،''سر سید احمد اور ان کے نامور رفقا کی علمی و ادبی خدمات''،سنگ میل پبلی کیشنز لاہور،۱۹۹۸ء،ص۲۲۳۔

۵۸ شبلی،ص۴۴۔

۵۹ ایضاً۔

۶۰ ڈاکٹر سلام سندیلوی، ''مولانا شبلی کی اردو شاعری''، مشمولہ: ماہ نامہ، ادیب، شبلی نمبر، علی گڑھ، ستمبر ۱۹۶۰ء، ص ۱۶۱۔

۶۱ شبلی، ص ۴۹۔

۶۲ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ''ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری''، قومی کونسل برائے فروغ اردو، دہلی، ۲۰۰۳ء، ص ۳۳۵۔

۶۳ ایضاً، ص ۳۳۶۔

۶۴ سید سلیمان ندوی،، ۱۹۸۹ء، ص ۶۸۔

۶۵ شبلی، ص ۶۹۔

۶۶ احمد اسحاق نعمانی، ''شبلی اور سیاست''، مشمولہ: ماہ نامہ، ادیب، شبلی نمبر، علی گڑھ، ستمبر ۱۹۶۰ء، ص ۱۲۷۔

۶۷ شبلی، ص ۵۱۔

۶۸ سید سلیمان ندوی، ''حیات شبلی''، در مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۹۴۳ء، ص ۵۹۳۔

۶۹ علامہ شبلی نعمانی، ''مکاتیب شبلی''، حصہ اوّل، مرتبہ: سید سلیمان ندوی، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۸۹، ص ۳۲۱۔

۷۰ ایضاً، ص ۳۲۲۔

۷۱ شبلی، ص ۵۳۔

۷۲ سید رئیس جعفری، ''کاروان گم گشتہ''، سید رئیس احمد جعفری اکیڈمی، کراچی، ۱۹۷۱ء، ص ۳۰۶۔

۷۳ صغرا مہدی، ''اکبر الٰہ آبادی''، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۳ء، ص ۳۰۔

۷۴ ایضاً، ص ۳۱۔

۷۵ عبدالماجد دریابادی، ''اکبر کا سیاسی مسلک''، مشمولہ: ماہ نامہ، نگار، اکبر الٰہ آبادی نمبر، کراچی، ۱۹۶۹ء، ص ۱۴۔

۷۶ ایضاً، ص ۱۵۔

۷۷ اکبر الٰہ آبادی، کلیات اکبر الٰہ آبادی، مکتبہ شعر و ادب لاہور، س ن، ص ۵۷۔

۷۸ اکبر الٰہ آبادی، ''کلیات اکبر الٰہ آبادی''، اسرار کریمی پریس، الٰہ آباد، ۱۹۳۲ء، ص ۲۹۔

۷۹ ایضاً۔

۸۰ سید شبیہ الحسن نونہروی، ''مضامین اکبری''، مشمولہ: علی گڑھ میگزین، اکبر نمبر، جلد نمبر ۳۴، علی گڑھ، ۱۹۵۰ء، ص ۱۹۔

۸۱ ایضاً۔

۸۲ ایضاً، ص ۲۰۔

۸۳ ایضاً۔

۸۴ طالب الٰہ آبادی، ''اکبر الٰہ آبادی''، مطبع انوار احمدی، الٰہ آباد، س ن، ص ۸۱۔

۸۵ ایضاً، ص ۷۹۔

۸۶ ایضاً،ص۷۸۔

۸۷ ایضاً۔

۸۸ ایضاً،ص۸۰۔

۸۹ ایضاً،ص۸۱۔

۹۰ ایضاً،ص۱۱۵۔

۹۱ ایضاً۔

۹۲ ایضاً۔

۹۲ ایضاً،ص۱۱۷۔

۹۳ ایضاً،ص۹۰۔

۹۴ اکبرالہ آبادی،۱۹۳۲ء،ص۱۰۹۔

۹۵ ایضاً۔

۹۶ ایضاً،ص۱۹۲۔

۹۷ ایضاً،ص۱۰۲۔

۹۸ مرزا احسان الحق،''قطعات رباعیات''،حصہ دوم،بزم اکبر،کراچی،س ن،ص۱۲۷۔

۹۹ ایضاً۔

۱۰۰ ایضاً،ص۱۲۸۔

۱۰۱ ایضاً،ص۱۴۳،۱۴۴۔

۱۰۲ ایضاً،ص۱۴۴۔

۱۰۳ ایضاً،ص۱۴۵۔

۱۰۴ ایضاً،ص۱۰۸۔

۱۰۵ ایضاً۔

۱۰۶ ڈاکٹر محمد طاہر قریشی،''ہماری ملی شاعری میں نعتیہ عناصر''،پی ایچ ڈی کا غیر مطبوعہ مقالہ،شعبہ اردو،جامعہ کراچی،۲۰۱۲ء،ص۱۲۳۔

۱۰۷ ضیاءالدین احمد برنی،''عظمت رفتہ''،کراچی،۱۹۶۱ء،ص۵۳۔

۱۰۸ محمد علی جوہر،''*My life is a Fragmatism*''،مرتبہ:ایس ایچ محمد اشرف،لاہور،۱۹۶۶ء،ص۵۹؛جوہر کو خودکشی سے بچانے والے سرراس مسعود تھے۔تفصیلات کے لیے دیکھیے،مولانا محمد علی کا ارادہ خودکشی،ڈاکٹر سید حامد حسین،مشمولہ:جامعہ،جوہر نمبر،اپریل ۱۹۷۹ء،دہلی، ص۳۸۔

۱۰۹؎ ایضاً۔

۱۱۰؎ برنی،ص۵۳۔

۱۱۱؎ افشاں عنایت،''تحریک اتحاد اسلامی اور اردو شاعری''،ایم اے اردو کا غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ،شعبہ اردو، جامعہ،کراچی،۲۰۰۶ء،ص۵۱۔

۱۱۲؎ عبدالرؤف عروج،''محمد علی جوہر اور ان کی شاعری''،سلطان حسین اینڈ سنز،کراچی،۱۹۶۳ء،ص۱۴۔

۱۱۳؎ ایضاً،ص۲۹۔

۱۱۴؎ محمد علی جوہر،مشمولہ:''محمد علی جوہر اور ان کی شاعری''،مرتبہ:عروج،عبدالرؤف،سلطان حسین اینڈ سنز،کراچی،جنوری ۱۹۶۳ء،ص۵۰۔

۱۱۵؎ سید ابوالحسن ندوی،''مولانا محمد علی جوہر،چند نقوش و تاثرات''،مشمولہ،جامعہ،جوہر نمبر،جلد ۷۶،شمارہ ۳،جامعہ ملیہ اسلامیہ،دہلی،اپریل ۱۹۷۹ء،ص۳۶۔

۱۱۶؎ پروفیسر محمد مجیب،''مولانا محمد علی اپنی شکست کی آواز''،ترجمہ:انوار احمد صدیقی،مشمولہ:جامعہ،جوہر نمبر،جلد ۷۶،شمارہ ۳،جامعہ ملیہ اسلامیہ،دہلی، اپریل ۱۹۷۹ء،ص۹۲۔

۱۱۷؎ ایضاً،ص۹۴۔

۱۱۸؎ جوہر،ص۱۱۶۔

۱۱۹؎ انور صدیقی،شعلے کی سرگزشت،مشمولہ:جامعہ،جوہر نمبر،جلد ۷۶،شمارہ ۳،جامعہ ملیہ اسلامیہ،دہلی،اپریل ۱۹۷۹ء،ص۱۶۷۔

۱۲۰؎ ایضاً۔

۱۲۱؎ ایضاً،ص۱۶۹۔

۱۲۲؎ جوہر،ص۱۱۴۔

۱۲۳؎ ایضاً،ص۳۸۔

۱۲۴؎ ایضاً،ص۳۷۔

۱۲۵؎ ایضاً،ص۵۳۔

۱۲۶؎ انعام عظیم برنی،''مولانا محمد علی جوہر کی شاعری''،مشمولہ سہ ماہی العلم،کراچی،اکتوبر تا دسمبر ۱۹۵۶ء،ص۴۳۔

۱۲۷؎ ایضاً،ص۵۰۔

۱۲۸؎ محمد اسلم سیفی،''حیات و کلیات اسمٰعیل میرٹھی''،مکتبہ اسلامیہ،دہلی،۱۹۳۹ء،ص۱۲۔

۱۲۹؎ ڈاکٹر وقار احمد رضوی،''تاریخ جدید اور اردو غزل''،نیشنل بک فاؤنڈیشن،اسلام آباد،۱۹۸۹ء،ص۲۱۴۔

۱۳۰؎ ایضاً،ص۲۱۶۔

۱۳۱؎ اسمٰعیل میرٹھی،''حیات و کلیات اسمٰعیل میرٹھی''،مکتبہ اسلامیہ،دہلی،۱۹۳۹ء،ص۱۳۴۔

۱۳۲؎ سیفی،ص۵۲۔

۱۳۳؎ میرٹھی،ص۷۸۔

۱۳۴۔ ایضاً، ص ۷۹۔

۱۳۵۔ ایضاً، ص ۸۰۔

۱۳۶۔ ایضاً، ص ۲۴۴۔

۱۳۷۔ ایضاً، ص ۱۷۶، ۱۷۷۔

۱۳۸۔ معین الدین عقیل، ''تحریک آزادی میں اردو کا حصہ''، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۲۶۸۔

۱۳۹۔ ''پروفیسر شریف المجاہد، سخت کوشی اور المناک تجربوں کی ایک داستان''، مشمولہ جہات حسرت، مرتبہ: ڈاکٹر سید احمد جعفر احمد، پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی، مئی ۲۰۰۸ء، ص ۱۷۔

۱۴۰۔ سید سلیمان ندوی، حسرت کی سیاسی زندگی، مشمولہ: ماہ نامہ، نگار، کراچی، اپریل جون ۱۹۷۶ء، ص ۴۸۔

۱۴۱۔ ڈاکٹر نفیس احمد صدیقی، ''حسرت موہانی اور انقلاب آزادی''، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، س ن، ص ۱۱۱۔

۱۴۲۔ سید فضل الحسن حسرت، ''کلیات حسرت''، کتاب منزل لاہور، ۱۹۵۹ء، ص ۴۳۔

۱۴۳۔ صدیقی، ص ۱۴۰۔

۱۴۴۔ احمد سلیم، ''حسرت کی سیاست''، پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی، ۲۰۰۰ء، ص ۹۰۔

۱۴۵۔ صدیقی، ص ۱۴۰۔

۱۴۶۔ حسرت، ص ۱۷۔

۱۴۷۔ محمود الرحمٰن، ص ۲۵۰۔

۱۴۸۔ ایضاً، ص ۱۵۱۔

۱۴۹۔ ایضاً، ص ۲۵۲۔

۱۵۰۔ حسرت، ص ۱۸۔

۱۵۱۔ محمود الرحمٰن، ص ۲۵۲۔

۱۵۲۔ حسرت، ص ۲۳۔

۱۵۳۔ جعفری، ص ۴۰۰۔

۱۵۴۔ ''الہلال''، جنوری ۱۹۱۳ء، کلکتہ، ص ۱۰۔

۱۵۵۔ ڈاکٹر عبدالغفور نسبل، ''وسطی ایشیا کے ترک''، مشمولہ: سہ ماہی، العلم، کراچی، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۵۴ء، ص ۱۰۔

۱۵۶۔ حسرت، ص ۱۰۹۔

۱۵۷۔ نسبل، ص ۱۱۔

۱۵۸۔ حسرت، ص ۱۴۴۔

۱۵۹ ایضاً۔

۱۶۰ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ''ظفر علی خان ادیب و شاعر''، مکتبہ خیابان ادب، لاہور، ۱۹۶۷ء، ص ۳۸۔

۱۶۱ شورش کاشمیری، ''قید فرنگ مولانا ظفر علی خان کے ایام اسیری''، مطبوعات چٹان لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۶۷ء، ص ۱۳۔

۱۶۲ محمود الرحمٰن، ص ۲۳۹۔

۱۶۳ مولانا ظفر علی، ''کلیات مولانا ظفر علی خان''، مرتبہ: زاہد علی خان، مولانا ظفر علی خاں ٹرسٹ، لاہور، ۲۰۱۰، ص ۱۶۲۔

۱۶۴ ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی، ''مولانا ظفر علی خان احوال و آثار''، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۹۲۔

۱۶۵ عنایت، ص ۸۳۔

۱۶۶ ظفر علی، ص ۱۶۶۔

۱۶۷ ایضاً، ص ۱۷۰۔

۱۶۸ ڈاکٹر طاہر قریشی، ''قرآن اور ظفر علی خان''، قرطاس، کراچی، ۲۰۱۴ء، ص ۱۲۔

۱۶۹ ظفر علی، ص ۱۸۲۔

۱۷۰ ایضاً، ص ۲۶۷۔

۱۷۱ ایضاً، ص ۹۹۔

۱۷۲ زیدی، ص ۱۰۲۔

۱۷۳ ایضاً، ص ۱۰۴۔

۱۷۴ ایضاً، ص ۱۵۹۔

۱۷۵ ایضاً، ص۔

۱۷۶ ایضاً، ص ۱۶۰۔

۱۷۷ ظفر علی، ص ۱۶۰۔

۱۷۸ ظفر علی، ''خطبہ صدارت خلافت کانفرنس برہان پور مارچ ۱۹۲۰ء''، مشمولہ مولانا ظفر علی خان حیات، خدمات و آثار، پروفیسر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص ۶۹۳۔

۱۷۹ ظفر علی، ص ۴۴۰۔

۱۸۰ ن۔م۔راشد، ''ظفر علی خان شاعر کی حیثیت سے''، مشمولہ پندرہ روزہ آج کل، دہلی، ۱۵ اگست ۱۹۴۳ء، ص ۱۱۔

۱۸۱ ظفر علی، ص ۳۷۰۔

۱۸۲ ظفر علی خان، ''مولانا ظفر علی خان کی آپ بیتی''، مرتبہ: رابعہ طارق، ندوۃ المعارف لاہور، ۱۹۹۹ء، ص ۱۴۸۔

۱۸۳ ایضاً، ص ۱۴۹۔

۱۸۴۔ ایضاً،ص۱۶۹۔

۱۸۵۔ ایضاً،ص۱۷۴۔

۱۸۶۔ علامہ اقبال،''اقبال نامہ مجموعہ مکاتیب اقبال''،مرتبہ:شیخ عطاء اللہ،اقبال اکادمی پاکستان،۲۰۰۵ء،ص۳۴۷۔

۱۸۷۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار،''اقبال اتحاد اسلامی اور ہم''،مشمولہ:سہ ماہی اقبال،بزم اقبال،لاہور،جنوری ۱۹۹۹ء،ص۵۹۔

۱۸۸۔ علامہ اقبال،''جاوید نامہ''،ترجمہ:مزملہ شفیق،اقبال اکادمی پاکستان،۲۰۰۷ء،ص۱۹۔

۱۸۹۔ ایضاً۔

۱۹۰۔ علامہ اقبال،''کلیات اقبال''،(بانگ درا)،اقبال اکادمی،پاکستان،۲۰۰۴ء،ص۱۸۷۔

۱۹۱۔ ایضاً،ص۱۸۸۔

۱۹۲۔ سید ابوالحسن ندوی،نقوش اقبال،سروسز بک کلب،کراچی،ص۷۳۔

۱۹۳۔ اقبال،۲۰۰۴ء،ص۱۸۹۔

۱۹۴۔ پروفیسر اسلوب احمد انصاری،''اقبال کی تیرہ نظمیں''،مجلس ترقی ادب،لاہور،۱۹۷۷ء،ص۸۶۔

۱۹۵۔ ڈاکٹر سید محمد اکرام،اقبال اور ملی تشخص،بزم اقبال،لاہور،۱۹۹۸ء،ص۲۲۔

۱۹۶۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی،''اقبال کی طویل نظمیں''،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۴ء،ص۳۳۔

۱۹۷۔ ایضاً،ص۳۸۔

۱۹۸۔ اقبال،۲۰۰۴ء،ص۱۹۱۔

۱۹۹۔ اقبال،۲۰۰۵ء،ص۴۴۹۔

۲۰۰۔ ایضاً؛یہ اشعار اقبال کے کسی بھی مجموعہ کلام میں موجود نہیں ہے۔

۲۰۱۔ اقبال،۲۰۰۴ء،ص۲۵۳۔

۲۰۲۔ خان،محمد احمد،''اقبال کا سیاسی کارنامہ''،کاروان ادب،کراچی،۱۹۵۲ء،ص۶۱۔

۲۰۳۔ اقبال،۲۰۰۴ء،ص۲۴۳۔

۲۰۴۔ یوسف سلیم چشتی،''شرح بانگ درا''،عشرت پبلشنگ ہاؤس،لاہور،س ن،ص۳۷۹۔

۲۰۵۔ ایضاً۔

۲۰۶۔ اقبال،۲۰۰۴ء،ص۲۲۵۔

۲۰۷۔ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان،''کلام اقبال کا تاریخی وسیاسی پس منظر''،مشمولہ:صریر خامہ،قومی شاعری نمبر،سندھ یونیورسٹی،شعبہ اردو،۱۹۶۶ء،ص۲۵۔

۲۰۸۔ ہاشمی،ص۷۳۔

۲۰۹۔ انصاری،ص۳۶۔

۲۱۰ اقبال،۲۰۰۴ء،ص۲۱۴۔

۲۱۱ چشتی،ص۴۱۲۔

۲۱۲ ایضاً۔

۲۱۳ اقبال،۲۰۰۴ء،ص۱۷۲۔

۲۱۴ انصاری،ص۸۵۔

۲۱۵ خان،ص۲۷۔

۲۱۶ ز،خ،ش،''فروس تخیل''،دارالاشاعت پنجاب،لاہور،۱۹۴۱ء،ص۳۸۔

۲۱۷ شان الحق حقی،نکتہ راز،عصر کتب،کراچی،۱۹۷۲ء،ص۲۸۹۔

۲۱۸ ز،خ،ش،ص۴۰۔

۲۱۹ ایضاً،ص۴۶۔

۲۲۰ ایضاً،ص۴۲۔

۲۲۱ ایضاً،ص۴۴۔

۲۲۲ ایضاً،ص۴۶۔

۲۲۳ ایضاً،ص۵۴۔

۲۲۴ ڈاکٹر فاطمہ حسن،''زخ خش حیات وشاعری کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ''،انجمن ترقی اردو پاکستان،۲۰۰۷ء،ص۲۴۰۔

۲۲۵ ز،خ،ش،ص۵۵۔

۲۲۶ ایضاً،ص۵۹۔

۲۲۷ ایضاً،ص۶۶۔

۲۲۸ ایضاً،ص۶۶۔

۲۲۹ ایضاً،ص۶۹۔

۲۳۰ ایضاً،ص۷۶۔

۲۳۱ ابراہیم بیگ چغتائی،''جنگ یونان وروم''،در مطبع خیر خواہ،اسلام،۱۹۰۹ء،ص۱۔

۲۳۲ ایضاً۔

۲۳۳ ایضاً،ص۲۔

۲۳۴ ایضاً،ص۱۱۲۔

۲۳۵ ایضاً،ص۱۲۹۔

۲۳۶۔ ایضاً،ص ۱۳۰۔

۲۳۷۔ ایضاً،ص ۱۳۱۔

۲۳۸۔ ایضاً،ص ۱۱۵۔

۲۳۹۔ ایضاً،ص ۱۹۴۔

۲۴۰۔ ایضاً،ص ۲۰۳۔

۲۴۱۔ شیخ نورالدین جیواخان، ''قصہ شاہ روم''، درمطبع صفدر واقع بندر، بمبئی،۱۳۰۲ھ،ص ۳۔

۲۴۲۔ آغا غلام حسین ارشد، ''نالہ جگر سوز''، مشمولہ: ماہ نامہ،تمدن، دہلی، اپریل ۱۹۱۲ء،ص ۵۳۔

۲۴۳۔ ایضاً،ص ۵۴۔

۲۴۴۔ ایضاً،ص ۵۵۔

۲۴۵۔ آغا غلام حسین ارشد، ''تازہ ستم''، مشمولہ، ماہ نامہ،تمدن، دہلی، فروری ۱۹۱۲ء،ص ۵۷۔

۲۴۶۔ ایضاً،ص ۵۸۔

۲۴۷۔ آغا غلام حسین ارشد، ''ہاتف کی صدا''، مشمولہ: ماہ نامہ،تمدن، دہلی، جون ۱۹۱۲ء،ص ۲۰۔

۲۴۸۔ ایضاً،ص ۲۱۔

۲۴۹۔ عنایت،ص ۱۳۵۔

۲۵۰۔ آغا غلام حسین ارشد، مکالمہ ''رندوشیخ''، مشمولہ: ماہ نامہ،تمدن، دہلی، جولائی ۱۹۱۲ء،ص ۱۹۔

۲۵۱۔ آغا غلام حسین ارشد، ''اسلام''، مشمولہ، ماہ نامہ،تمدن، دہلی، اگست ۱۹۱۲ء،ص ۲۸۔

۲۵۲۔ ایضاً،ص ۲۹۔

۲۵۳۔ ایضاً،ص ۳۰۔

۲۵۴۔ آغا غلام حسین ارشد، ''ساقی نامہ''، مشمولہ، ماہ نامہ،تمدن، دہلی، اکتوبر ۱۹۱۲ء،ص ۶۰۔

۲۵۵۔ ایضاً،ص ۶۳۔

۲۵۶۔ حفاظت حسین، ''دردجگر''، حصہ اوّل، درمطبع اخبار الپنچ، بانکی پورہ، س ن،ص ۲۔

۲۵۷۔ شاہ قسیم الدین، ''دردجگر''، حصہ اوّل، درمطبع اخبار الپنچ، بانکی پورہ، س ن،ص ۳۔

۲۵۸۔ ایضاً۔

۲۵۹۔ ایضاً،ص ۱۱۔

۲۶۰۔ ایضاً،ص ۲۱۔

۲۶۱۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ۱۹۶۶ء، ۴۴۳۔

۲۶۲ ڈاکٹر محمد شفیع، ''آغا حشر کاشمیری اور ان کے ڈراموں کا تنقیدی مطالعہ''، فخر الدین علی میموریل کمیٹی، اتر پردیش، مارچ ۱۹۸۸ء، ص ۳۷۶۔

۲۶۳ ایضاً، ص ۳۷۹۔

۲۶۴ ایضاً، ص ۳۸۰۔

۲۶۵ ایضاً، ص ۳۷۶۔

۲۶۶ ایضاً، ص ۳۷۷۔

۲۶۷ ایضاً، ص ۳۷۸۔

۲۶۸ ایضاً۔

۲۶۹ ایضاً، ص ۳۷۹۔

۲۷۰ ایضاً، ص ۷۹۔

۲۷۱ ایضاً، ص ۳۸۱۔

۲۷۲ مولانا تمنا عمادی، ''کیا اسلام تلوار کے زور سے پھیلا''، مشمولہ، ماہ نامہ، تمدن، دہلی، دسمبر ۱۹۱۲ء، ص ۱۶۔

۲۷۳ ایضاً۔

۲۷۴ مولانا تمنا عمادی، ''دنیائے اسلام''، مشمولہ، ماہ نامہ، تمدن، دہلی، جون ۱۹۱۲ء، ص ۵۴؛ یہاں پر لفظ 'دودم' جو مولانا تمنا عمادی نے استعمال کیا ہے اس سے مراد روم یعنی ترکی اور ایران ہے۔

۲۷۵ مولانا تمنا عمادی، مشمولہ: ماہ نامہ، تمدن، دہلی، جون ۱۹۱۴ء، ص ۵۴۔

۲۷۶ _____، ''اسلام اب کہاں رہتا ہے''، مشمولہ: ماہ نامہ، تمدن، دہلی، اگست ۱۹۱۲ء، ص ۱۰۔

۲۷۷ _____، ''ہلال احمر''، مشمولہ، ماہ نامہ، تمدن، دہلی، جون ۱۹۱۳ء، ص ۷۶۔

۲۷۸ _____، ''طرابلس کی ایک ستم رسیدہ عورت کی مناجات''، مشمولہ، ماہ نامہ ''الناظر''، جلد ۶، شمارہ ۳۲، لکھنو، ۱۳۲۷ھ، ص ۴۹۔

۲۷۹ _____، قطعہ، مشمولہ، ماہ نامہ، ''تمدن''، دہلی، دسمبر ۱۹۱۲ء، ص ۲۲۔

۲۸۰ _____، ''اپنا ترانہ''، مشمولہ، ماہ نامہ، ''تمدن''، دہلی، مئی ۱۹۱۲ء، ص ۱۰۔

۲۸۱ _____، مشمولہ: ماہ نامہ، ''تمدن''، دہلی، جنوری ۱۹۱۳ء، ص ۳۹۔

۲۸۲ _____، ''سراپا نبی کریم ﷺ''، مشمولہ، ماہ نامہ، ''تمدن''، دہلی، ستمبر ۱۹۱۲ء، ص ۳۳۔

۲۸۳ _____، ''ھل جزاء الاحسان الا الاحسان''، مشمولہ، ماہ نامہ، ''الناظر''، لکھنو، جون ۱۹۲۳ء، ص ۵۵؛ مولانا تمنا عمادی کی غزلیں اور نظمیں الناظر کے شمارے میں بھی موجود ہیں۔ اپریل ۱۹۱۱ء میں ان کی نعت اور نعتیہ غزل ص ۳۵ پر ہے۔ نومبر ۱۹۱۰ء 'الناظر' میں ہی ایک اور غزل ص ۵۶ پر موجود ہے۔ اسی رسالے میں دسمبر ۱۹۲۳ء میں انھوں نے ایک شاندار نظم موت کے حوالے سے لکھی جس کا عنوان یہ ہے 'نہ کچھ کہتا، نہ کچھ سنتا کوئی شہر خموشاں میں'، اس میں بھی انھوں نے پوری مسلمان امت کو بے دار کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

۲۸۴ پروفیسر جعفر رضا، ''عبدالحلیم شرر''، ساہتیہ اکادمی، انڈیا، ۱۹۸۸ء، ص ۱۱۹۔

۲۸۵ شرر، عبدالحلیم، ''زمانہ اور اسلام''، مشمولہ، ''عبدالحلیم شرر بہ حیثیت شاعر''، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۰۰ء، ص ۱۳۰۔

۲۸۶ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، ''عبدالحلیم شرر بہ حیثیت شاعر''، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۰ء، ص ۱۳۲۔

۲۸۷ شرر، ص ۱۳۱۔

۲۸۸ ایضاً، ص ۱۲۹۔

۲۸۹ ایضاً، ص ۱۱۷۔

۲۹۰ صفی لکھنوی، ''انتخاب کلام صفی لکھنوی''، مرتبہ، سید زائر حسین، اتر پردیش اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۸۳ء، ص ۳۳۔

۲۹۱ ممتاز حسین جون پوری، ''لخت جگر''، لکھنؤ، ۱۹۳۴ء، ص ۲۷۔

۲۹۲ اشتیاق حسین سلونوی، درد دل، مطبوعہ حسن برقی پریس، ہیوٹ روڈ، لکھنؤ، س ن، ص ۱۵۔

۲۹۳ ایضاً، ص ۲۶۔

۲۹۴ ایضاً، ص ۲۷۔

۲۹۵ ایضاً، ص ۴۸۔

۲۹۶ ظفر الملک علوی، تبصرہ، مشمولہ، ماہ نامہ، ''الناظر''، لکھنؤ، دسمبر ۱۹۱۲ء، ص ۸۴۔

۲۹۷ ہاشمی فرید آبادی، ''چل بلقان چل''، مشمولہ، ماہ نامہ، ''الناظر''، لکھنؤ، دسمبر ۱۹۱۲ء، ص ۵۸۔

۲۹۸ _____، مارچ اپریل، ۱۹۳۶ء، قطعہ، مشمولہ، ماہ نامہ، ''الناظر''، لکھنؤ، ص ۱۴۔

۲۹۹ _____، ''ٹریپولی''، مشمولہ: ماہ نامہ، 'تمدن'، جلد ۲ نمبر ۳، دسمبر ۱۹۱۱ء، ص ۲۹۔

۳۰۰ _____، ''بس اب ہے آج سے آغاز میری کارفرمائی''، مشمولہ، 'نوائے آزادی'، مرتبہ: عبدالرزاق کانپوری، ادبی پبلی شرز، بمبئی، ۱۹۵۷ء، ص ۱۳۲۔

۳۰۱ ایضاً۔

۳۰۲ لکھنوی، عزیز، ''آہ رسا''، مشمولہ، ماہ نامہ، 'تمدن'، جلد ۱ نمبر ۲، دہلی، مئی ۱۹۱۱ء، ص ۶۲۔

۳۰۳ _____، ''اشاعت اسلام''، مشمولہ، ماہ نامہ، 'تمدن'، جلد ۱ نمبر ۴، دہلی، جولائی ۱۹۱۱ء، ص ۳۸۔

۳۰۴ _____، ''نالہ دل''، مشمولہ، ماہ نامہ، 'تمدن'، جلد ۲ نمبر ۲، دہلی، نومبر ۱۹۱۱ء، ص ۴۵۔

۳۰۵ علامہ اقبال، بہ حوالہ، رضا علی وحشت، مشمولہ، ''مشرب''، جلد ۲ شمارہ ۱، کراچی، جون جولائی ۱۹۵۲ء، ص ۱۳۸۲۔

۳۰۶ وحشت، رضا علی، ''فغان مسلم''، مشمولہ، ماہ نامہ، 'تمدن'، دہلی، مارچ ۱۹۱۳ء، ص ۷۲۔

فہرستِ اسنادِ محولہ:

۱۔ احسان الحق، مرزا: س ن، ''قطعات ورباعیات''، حصہ دوم، بزم اکبر، کراچی۔

۲۔ اقبال، علامہ: ۲۰۰۴ء، کلیات اقبال، (بانگ درا)، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔

۳۔ _____: ۲۰۰۵ء، اقبال نامہ مجموعۂ مکاتیب اقبال، مرتبہ: شیخ عطاء اللہ، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔

۴۔ _____: ۲۰۰۷ء، جاوید نامہ، ترجمہ: مزملہ شفیق، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔

۵۔ اکرام، محمد، سید، ڈاکٹر: اکتوبر ۱۹۹۸ء، اقبال اور ملی تشخص، بزم اقبال، لاہور۔

۶۔ الٰہ آبادی، اکبر: ۱۹۳۲ء، کلیاتِ اکبر الٰہ آبادی، اسرار کریمی پریس، الٰہ آباد۔

۷۔ _____: س ن، کلیاتِ اکبر الٰہ آبادی، مکتبہ شعر وادب، لاہور۔

۸۔ الٰہ آبادی، طالب: س ن، اکبر الٰہ آبادی، مطبع انوار احمدی، الٰہ آباد۔

۹۔ انصاری، اسلوب احمد، پروفیسر: جنوری ۱۹۷۷ء، اقبال کی تیرہ نظمیں، مجلس ترقی ادب، لاہور۔

۱۰۔ برنی، احمد، ضیاء الدین: ۱۹۶۱ء، عظمتِ رفتہ، کراچی۔

۱۱۔ تبسم، توصیف، ڈاکٹر: س ن، ''جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کا مجاہد شاعر''، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد۔

۱۲۔ جالبی، جمیل، ڈاکٹر: فروری ۲۰۱۲ء، ''تاریخ ادب اردو''، جلد چہارم، مجلس ترقی ادب، لاہور۔

۱۳۔ جعفری، رئیس احمد، سید: ۱۹۷۱ء، ''کاروانِ گم گشتہ''، سید رئیس احمد جعفری اکیڈمی، کراچی۔

۱۴۔ جون پوری، ممتاز حسین: فروری ۱۹۳۴ء، ''لختِ جگر''، لکھنو۔

۱۵۔ جوہر، محمد علی: ۱۹۶۶ء، ''My life is a Fragmatism''، مرتبہ، ایس ایچ محمد اشرف، لاہور۔

۱۶۔ جوہر، محمد علی: جنوری ۱۹۶۳ء، ''محمد علی جوہر اور ان کی شاعری''، مرتبہ عبدالرؤف عروج، سلطان حسین اینڈ سنز، کراچی۔

۱۷۔ جیوا، خان، نورالدین، شیخ: ۱۳۰۲ھ، ''قصہ شاہ روم''، در مطبع صفدر داقع بندر بمبئی۔

۱۸۔ چشتی، یوسف سلیم: س ن، ''شرح بانگ درا''، عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور۔

۱۹۔ چغتائی، بیگ، ابراہیم: ۱۹۰۹ء، ''جنگ یونان وروم''، در مطبع خیر خواہ اسلام، کراچی۔

۲۰۔ حالی: ۱۹۷۰ء، ''کلیات نظم حالی''، جلد دوم، مرتبہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، مجلس ترقی ادب، لاہور۔

۲۱۔ _____: ۱۹۲۴ء، ''کلیات نظم حالی''، جلد اول، مرتبہ شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی، حالی بک ڈپو، پانی پت۔

۲۲۔ _____: ۱۹۶۸ء، ''کلیات نظم حالی''، مرتبہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، مجلس ترقی ادب، لاہور۔

۲۳۔ حسرت، فضل الحسن، سیّد: ۱۹۵۹ء، ''کلیات حسرت''، کتاب منزل، لاہور۔

۲۴۔ حسن، فاطمہ، ڈاکٹر: ۲۰۰۷ء، ''زخ ش حیات وشاعری کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ''، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی۔

۲۵۔ حسین، حفاظت: س ن، ''دردِ جگر''، حصہ اوّل، در مطبع اخبار الیچ، بانکی پورہ۔
۲۶۔ حقی، شان الحق: ۱۹۷۲ء، ''نکتہ راز''، عصر کتب، کراچی۔
۲۷۔ خان، ظفر علی: ۱۹۹۹ء، ''مولانا ظفر علی خان کی آپ بیتی''، مرتبہ، رابعہ طارق، ندوۃ المعارف، لاہور۔
۲۸۔ _____: ۲۰۱۰ء، ''کلیات مولانا ظفر علی خان''، مرتبہ، زاہد علی خان، مولانا ظفر علی خاں ٹرسٹ، لاہور۔
۲۹۔ خان، محمد احمد: ۱۹۵۲ء، ''اقبال کا سیاسی کارنامہ''، کاروان ادب، کراچی۔
۳۰۔ _____: ۱۹۶۷ء، ''ظفر علی خان ادیب و شاعر''، مکتبہ خیابان ادب، لاہور۔
۳۱۔ _____: ۱۹۶۶ء، ''اردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر''، جامعہ پنجاب، لاہور۔
۳۲۔ خان، مصطفےٰ غلام، ڈاکٹر: ۲۰۰۳ء، ''حالی کا ذہنی ارتقا''، شہزاد، کراچی۔
۳۳۔ ذوالفقار، غلام حسین، ڈاکٹر: ۱۹۹۳ء، ''مولانا ظفر علی خان حیات، خدمات و آثار''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔
۳۴۔ رضا، جعفر، پروفیسر: ۱۹۸۸ء، ''عبدالحلیم شرر''، ساہتیہ اکادمی، انڈیا۔
۳۵۔ رضوی، وقار احمد، ڈاکٹر: ۱۹۸۹ء، ''تاریخ جدید اور اردو غزل''، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد۔
۳۶۔ ز، خ، ش: ۱۹۴۱ء، ''فردوسِ تخیل''، دارالاشاعت پنجاب، لاہور۔
۳۷۔ زیدی، نظیر حسنین، ڈاکٹر: ۱۹۸۶ء، ''مولانا ظفر علی خان احوال و آثار''، مجلس ترقی ادب، لاہور۔
۳۸۔ سلیم احمد: ۲۰۰۰ء، ''حسرت کی سیاست''، پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی۔
۳۹۔ سلونوی، اشتیاق: س ن، ''دردِ دل''، حسن برقی پریس، لکھنؤ۔
۴۰۔ سیفی، محمد اسلم: ۱۹۳۹ء، ''حیات و کلیات اسمٰعیل میرٹھی''، مکتبہ اسلامیہ، دہلی۔
شبلی، علامہ: ۱۹۸۹ء، کلیات شبلی، مرتبہ سید سلیمان ندوی، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد۔
۴۱۔ _____: ۱۹۸۹ء، ''مکاتیب شبلی''، حصہ اوّل، مرتبہ، سید سلیمان ندوی، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد۔
۴۲۔ شرر، عبدالحلیم: ۱۹۹۰ء، ''زمانہ اور اسلام''، مشمولہ ''عبدالحلیم شرر بہ حیثیت شاعر''، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔
۴۳۔ شریف المجاہد، پروفیسر: مئی ۲۰۰۸ء، ''سخت کوشی اور المناک تجربوں کی ایک داستان''، مشمولہ ''جہات حسرت''، مرتبہ ڈاکٹر سید جعفر احمد، پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی۔
۴۴۔ شفیع، محمد، ڈاکٹر: ۱۹۸۸ء، ''آغا حشر کاشمیری اور ان کے ڈراموں کا تنقیدی مطالعہ''، فخر الدین علی میموریل کمیٹی، اتر پردیش۔
۴۵۔ صدیقی، افتخار احمد: ۱۹۷۰ء، ''کلیات نظم حالی''، جلد دوم، مجلس ترقی ادب، لاہور۔
۴۶۔ صدیقی، نفیس احمد، ڈاکٹر: س ن، ''حسرت موہانی اور انقلاب آزادی''، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ۔
۴۷۔ عبدالحق، مولوی: ۱۹۷۶ء، ''افکارِ حالی''، انجمن ترقی اردو پاکستان، لاہور۔

۴۸۔ عبداللہ، سید: ۱۹۹۸ء، ''سرسید احمد اوران کے نامور رفقا کی علمی وادبی خدمات''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔
۴۹۔ عروج، عبدالرؤف: ۱۹۶۳ء، ''محمد علی جوہر اوران کی شاعری''، سلطان حسین اینڈ سنز، کراچی۔
۵۰۔ عقیل، معین الدین: ۲۰۰۸ء، ''تحریک آزادی میں اردو کا حصہ''، مجلس ترقی ادب، لاہور۔
۵۱۔ قریشی، محمد طاہر، ڈاکٹر: ۲۰۱۴ء، ''قرآن اور ظفر علی خان''، قرطاس، کراچی۔
۵۲۔ کاشمیری، شورش: ۱۹۶۷ء، ''قید فرنگ مولانا ظفر علی خان کے ایام اسیری''، مطبوعات چٹان لمیٹڈ، لاہور۔
۵۳۔ لکھنوی، صفی: ۱۹۸۳ء، ''انتخاب کلام صفی لکھنوی''، مرتبہ، سید زائر حسین، اتر پردیش اکادمی، لکھنو۔
۵۴۔ محمود الرحمٰن، ڈاکٹر: ۱۹۸۶ء، ''جنگ آزادی کے اردو شعرا''، قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ وثقافت، اسلام آباد۔
۵۵۔ محمود، سید فیاض، بریلوی، عبادت، ڈاکٹر، ۱۹۷۲ء، ''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند''، نویں جلد، پنجاب یونیورسٹی لاہور۔
۵۶۔ مہدی، صغرا: ۱۹۸۳ء، ''اکبرالہ آبادی''، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی۔
۵۷۔ میرٹھی، اسمٰعیل: ۱۹۳۹ء، ''حیات وکلیات اسمٰعیل میرٹھی''، مکتبہ اسلامیہ، دہلی۔
۵۸۔ نارنگ، گوپی چند، ڈاکٹر: ۲۰۰۳ء، ''ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری''، قومی کونسل برائے فروغ اردو، دہلی۔
۵۹۔ ندوی، سید سلیمان: ۱۹۴۳ء، ''حیات شبلی''، در مطبع معارف، اعظم گڑھ۔
۶۰۔ _____: س ن، ''نقوش اقبال''، سروسز بک کلب، کراچی۔
۶۱۔ _____: ۱۹۸۹ء، مرتبہ، ''کلیات شبلی''، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد۔
۶۲۔ ہاشمی، رفیع الدین، ڈاکٹر: ۲۰۰۴ء، ''اقبال کی طویل نظمیں''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔
۶۳۔ ہرگانوی، مناظر عاشق، ڈاکٹر: ۱۹۹۰ء، ''عبدالحلیم شرر بحیثیت شاعر''، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔

غیر مطبوعہ تحقیقی مقالات:

۱۔ عنایت، افشاں: ۲۰۰۶ء، ''تحریک اتحاد اسلامی اور اردو شاعری''، ایم اے اردو، شعبۂ اردو، جامعہ کراچی۔
۲۔ قریشی، محمد طاہر، ڈاکٹر:: ۲۰۱۲ء، ''ہماری ملی شاعری میں نعتیہ عناصر''، پی ایچ ڈی اردو، شعبۂ اردو، جامعہ کراچی۔

رسائل وجرائد:

۱۔ پندرہ روزہ ''آج کل''، دہلی، ۱۵ر اگست ۱۹۴۳ء۔
۲۔ ماہ نامہ ''ادیب''، علی گڑھ، شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء
۳۔ سہ ماہی ''الزبیر''، بہاول پور شمارہ ۲، ''تحریک آزادی نمبر''، ۱۹۷۰ء۔
۴۔ سہ ماہی ''اقبال''، لاہور، جنوری ۱۹۹۹ء
۵۔ سہ ماہی ''العلم''، کراچی، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۵۴ء، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۵۶ء۔
۶۔ ماہ نامہ ''الناظر''، لکھنو، دسمبر ۱۹۱۲ء

۷۔ ماہ نامہ ''تمدن''، دہلی، مئی ۱۹۱۱ء، فروری ۱۹۱۲ء، اپریل ۱۹۱۲ء، جون ۱۹۱۲ء، جولائی ۱۹۱۲ء، اگست ۱۹۱۲ء، اکتوبر ۱۹۱۲ء، دسمبر ۱۹۱۲ء، مارچ ۱۹۱۳ء، جون ۱۹۱۴ء۔

۸۔ ''جامعہ''، دہلی، جوہر نمبر، جلد ۶۷، شمارہ ۳، اپریل ۱۹۷۹ء،

۹۔ ''صریر خامہ''، قومی شاعری نمبر، شعبۂ اُردو، سندھ یونیورسٹی، جام شورو، ۱۹۶۶ء۔

۱۰۔ ماہ نامہ ''صحیفہ''، لاہور، حالی نمبر، شمارہ نمبر ۵۸، جنوری ۱۹۷۲ء۔

۱۱۔ ''علی گڑھ میگزین''، علی گڑھ، اکبر نمبر، جلد نمبر ۳۴، ۱۹۵۰ء۔

۱۲۔ ماہ نامہ ''مشرب''، کراچی جون جولائی ۱۹۵۲ء۔

۱۳۔ ماہ نامہ ''نگار''، کراچی، اکبر الہ آبادی نمبر، جون ۱۹۷۶ء، ۱۹۶۹ء۔